Regd.L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست ۔ 1971

ہماری آزادی کی غایت کیا ہے

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپکو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(قائد اعظم محمد علی جناح)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور ۹

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ
پاکستان سے سالانہ —— دس روپے	۸۰۸۰۰	ایک روپیہ
غیر ممالک سے سالانہ —— ایک پونڈ	خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام —— گلبرگ لاہور	

نمبر (۸)	اگست ۱۹۷۱ء	جلد (۲۴)

فہرست

۱۔ لمعات —— ۲

۲۔ خدا عمر رفتہ کو آواز دینا —— ۱۲

۳۔ طلوعِ اسلام کی تاریخ قسط ۳ —— (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) —— ۳۱

۴۔ طلوعِ اسلام کنونشن —— ۳۶

۵۔ آئینِ پاکستان —— ۴۳

۶۔ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات —— ۵۱

۷۔ اسلامی ریاست میں رہائشی مکانات کی ملکیت —— (شاہد عادل) —— ۵۷

۸۔ حقائق و عبر —— (دین اللہ یا دین الرسول) —— ۶۳

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵/ب گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

صدر مملکت نے جس پروگرام کا قوم کو اس شدت اور بے تابی سے انتظار تھا، وہ ان کی ۲۸ جون کی نشر شدہ تقریر کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ اس پروگرام کے مطابق:۔

(۱) مملکت کا آئین مرتب کرنے کے لئے، ماہرین دستور کی ایک کمیٹی متعین کر دی گئی ہے۔ اس کا مرتب کردہ آئین صدر مملکت کی تصویب کے بعد ملک میں نافذ کر دیا جائے گا، اور انتقال اقتدار اس آئین کے تابع ہوگا۔

(۲) مارشل لاء بدستور نافذ رہے گا۔

(۳) گذشتہ انتخابات بالکلیہ کالعدم قرار نہیں دیئے جائینگے۔

(۴) کالعدم عوامی لیگ کے جن ارکان نے ملک دشمن سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا، ان کا انتخاب کالعدم قرار دیا جائیگا اور انکی جگہ ضمنی انتخابات ہونگے۔ اس لیگ کے باقی ارکان کا انتخاب برقرار رہیگا۔

طلوع اسلام نے اپنی مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں مشورہ دیا تھا کہ

(۱) صدر مملکت، ملک کے ان ماہرین آئین و قوانین حضرات پر جن کی پاکستان کے ساتھ وفاشعاری شک و شبہ سے بالا ہو، مشتمل ایک کمیٹی مقرر کریں جو ملک کے لئے آئین کا مسودہ مرتب کرے۔ (ص۱۱)

(۲) مارشل لاء بدستور نافذ رہے۔ (ص۱۳)

(۳) مغربی پاکستان میں نئے انتخابات نہ کرائے جائیں۔ سابقہ انتخابات برقرار رکھے جائیں۔ (ص۱۲)

(۴) جو امیدوار کالعدم عوامی لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے، ان کا انتخاب کالعدم قرار دیا جائے اور اس پارٹی کے تمام ممبروں کو کم از کم دس سال تک کے لئے اسمبلیوں کی رکنیت بلکہ حق رائے دہندگی سے قانوناً محروم کر دیا جائے۔ (ص۱۲-۱۳)

یہ امر ہمارے لئے موجب اطمینان ہے کہ چوتھی شق کے علاوہ، ہماری بقایا تجاویز سے اتفاق کیا گیا۔ جہاں تک چوتھی شق کا تعلق ہے، ہم نے لکھا تھا کہ۔

> اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شیخ مجیب نے انہی افراد کو امیدواری کے ٹکٹ دیئے تھے جو اس کے ہم خیال تھے اور جن پر اسے پورا پورا اعتماد تھا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ حضرات مجیب کے عزائم سے بے خبر اور اس کے پروگرام سے لاتعلق تھے؟ (بنا بریں) ہم پوری قوت کے ساتھ کہیں گے کہ انہیں قطعاً ممبر نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ ..... اس پارٹی کی سازش کوئی چھوٹی سازش نہیں تھی جسے یونہی فراموش کر دیا جائے اور سانپ کو مار کر سپولیوں

کو دودھ پلا پلا کر پالا جاتا ہے۔ مملکت پاکستان کے تحفظ اور سالمیت کے علی الرغم کسی فرد کا کوئی حق بھی مسلّم نہیں۔ (ص ۲۱)

ہماری اب بھی یہی رائے ہے کہ وہ تمام ارکان جو کالعدم عوامی لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوتے تھے، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ یہ تو اس پارٹی کی تقسیم کار تھی کہ ان میں سے بعض میدان میں اتر کر ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور دوسرے پیچھے بیٹھے (فوج کے جرنیلوں کی طرح) ان کی کمان کرتے رہے۔ لہٰذا ان دونوں گروہوں میں کسی طرح بھی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ ان سب کی ذہنیت بھی ایک تھی اور عزائم بھی ایک۔

یہ بہرحال ہماری رائے ہے جس کا اظہار ہم نے ضروری سمجھا ہے۔ بایں ہمہ، ملک کے نظم و نسق کی عظیم اور نہایت گراں بار ذمہ داری صدر مملکت کے سر پر عاید ہوتی ہے اور وہی بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے کس طرح بطریقِ احسن سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ کم از کم مجوزہ آئین میں ایسی شق ضرور رکھ دیں گے جس سے اس قسم کے عناصر کسی وقت اور کسی طرح بھی بیباک نہ ہونے پائیں۔ سابقہ تجربہ انتہائی احتیاط کا متقاضی ہے۔

ہم نے لکھا تھا کہ اگر آئین مرتب کرنے کیلئے کسی کمیٹی کا تقرر عمل میں آگیا تو ہم آئین کے متعلق اپنی تجاویز ان کے گوش گزار کر دیں گے۔ ہم نے اسلامی مملکت کے آئین کے متعلق قرآنی اصولوں پر مشتمل ایک پمفلٹ (بزبانِ انگریزی) مرتب کر لیا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اسے مذکورہ بالا کمیٹی کے ارکان، نیز ملک کے ایسے مشاہیر تک پہنچا دیا جائے، جن سے (صدر مملکت کے اعلان کے مطابق) مسودہ آئین پر مشورہ لیا جانا متوقع ہے۔ ہم نے گزشتہ چوبیس سال میں آئین سازی کے ہر مرحلہ پر ایسا ہی کیا ہے، اور اب بھی ویسا ہی کرنے کا ارادہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اُن آئینی اصولوں کو اشاعتِ حاضرہ میں ایک بار پھر دہرا رہے ہیں جو طلوع اسلام کی فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع ہوتے تھے۔ اس سے قوم کی یاد دہانی مقصود ہے۔

(۲)

صدر مملکت کے پروگرام کا، ملک کے مختلف گوشوں کی طرف سے گرمجوشی سے استقبال ہوا ہے، اور یہ فال بہرحال نیک ہے۔ (ان سطور کی تحریر تک پیپلز پارٹی کے تاثرات البتہ سامنے نہیں آئے کیونکہ انہوں نے اس باب میں توقف برتا ہے۔ ممکن ہے پرچہ کو پریس میں بھیجنے سے پہلے وہ بھی منصۂ شہود پر آجائیں) اس سلسلہ میں ہمیں جماعتِ اسلامی کے ردعمل کا خاص طور پر انتظار تھا کیونکہ اس پروگرام کی اہم شقیں ان کے مؤقف کے خلاف تھیں۔ مودودی صاحب کا مؤقف یہ تھا کہ:

> ۷ اور ۱۷ دسمبر کے انتخابات کو اب قطعی کالعدم قرار دے دینا چاہئے کیونکہ جن حالات میں یہ انتخابات ہوتے اور جو حالات ان انتخابات کے بعد پیش آئے، ان کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ اس ساری اسکیم کو ساقط کر دیا جائے جس کے تحت یہ انتخابات کرائے گئے تھے۔ (ایشیا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

آئین کے سلسلہ میں انہوں نے فرمایا تھا کہ کسی جدید آئین کے مرتب کرنے کی ضرورت نہیں۔

> ہمارے پاس پہلے سے تین دستور موجود ہیں۔ ان میں سے جو دستور سب سے زیادہ ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جنہیں ملحوظ رکھ کر صدر صاحب نے ون یونٹ توڑنے، آبادی کی بنیاد پر نمائندگی دینے، اور لیگل فریم ورک آرڈر نافذ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ ۱۹۵۶ء کا دستور ہے۔ اس دستور کو ایک ایسی اسمبلی نے تیار کیا تھا جو دستور سازی کے لئے بنائی گئی تھی اور اس کے بنانے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام مسلم لیڈر شامل تھے۔ (ایشیا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

ضمناً قارئین کو یاد ہوگا کہ جماعتِ اسلامی نے اپنے انتخابی منشور میں ۱۹۵۶ء کا آئین اپنانے پر زور دیا تھا، اور ۱۹۵۶ء کے آئین کو

یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ

وہ آئین اس لئے آئینی دستاویز نہیں کہ ابھی اس کے پاس ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ دستور ساز اسمبلی کا بوریہ بستر لپیٹ دیا گیا تھا۔ اگر یہ پاس ہو جاتا اور ملک کا دستور قرار پا جاتا تو ہم اس کی بحالی پر اصرار کرتے۔ (ایشیا- ۴ جنوری ۱۹۷۰ء)

بہرحال' مودودی صاحب کا موقف یہ تھا کہ نیا آئین مرتب کرنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۵۶ء یا ۱۹۶۲ء کا دستور اپنا لینا چاہیئے اصحاب صدر مملکت نے اعلان کر دیا کہ نہ ۱۹۵۶ء کا آئین اپنایا جائیگا' نہ ۱۹۶۲ء کا۔ بلکہ ایک نیا آئین مرتب کیا جائے گا۔ اس سے ہم تشویش سے تھے کہ دیکھیں' ان حضرات کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔

ہماری اس تشویش کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ مودودی صاحب نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے خلاف یہ کہہ کر مہم چلائی تھی کہ وہ ایک شخص کا نافذ کردہ دستور ہے جو جمہوری نقطۂ نگاہ سے قطعاً قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے اسی بنا پر برپا کرائے گئے تھے۔ اب صدر مملکت نے یہ اعلان فرما دیا کہ وہ اپنا مرتب کردہ آئین نافذ کریں گے۔ یعنی یہ آئین بھی ایک فرد ہی کا نافذ کردہ ہوگا۔ ہمیں اس جہت سے بھی جماعتِ اسلامی کے ردِ عمل کا انتظار تھا۔

اور اس جہت سے بھی کہ صدر مملکت نے مودودی صاحب کی اس تجویز کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات بالکلیہ کالعدم قرار دے دیئے جائیں۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ مودودی صاحب کا "دین میں حکمتِ عملی" کا اصول آڑے آ گیا اور انہوں نے اعلان فرما دیا کہ:-

صدر مملکت نے ملک کے آئندہ آئینی نظام کے متعلق جو اسکیم پیش کی ہے' موجودہ بحرانی حالات میں وہ مناسب ترین ہے اور جماعتِ اسلامی اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ (ایشیا- ۴ جولائی ۱۹۷۱ء)

اور قائم مقام امیر جماعت' میاں طفیل محمد نے اپنے بیان میں کہا کہ:

ہم صدر صاحب کے حالیہ فیصلہ سے مطمئن ہی نہیں' بہت خوش ہیں۔

اس کے بعد' یہ فقرہ بھی ملاحظہ فرمایئے:-

صاحب صدر نے ہمارا یہ موقف تسلیم کر لیا ہے کہ موجودہ سیاسی بحران میں قومی اسمبلی آئین سازی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی۔ اس کی مناسب ترین صورت یہی ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی طے شدہ حدود کے اندر ایک مسودہ دستور بنا کر اسمبلی میں پیش کر دے اور اسمبلی کے نمائندے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔ (ایضاً)

ہم' اس احساس سے کہ خدا کا شکر ہے کہ اس جماعت نے' اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق' کسی نئے فتنے کو ہوا نہیں دی۔ اس قدر خوش ہیں کہ ہم ان سے اتنا دریافت کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ حضور! آپ نے یہ موقف کب اختیار کیا تھا کہ ماہرین کی ایک کمیٹی ایک نئے آئین کا مسودہ مرتب کرے! ایسے حالات میں یہی کہنا زیادہ مناسب ہوتا ہے کہ:

نہ ہم سمجھے' نہ تم آئے کہیں سے ؎ پسینہ پونچھیئے اپنی جبیں سے

———— (۱) ————

صدر محترم نے فرمایا ہے کہ مجوزہ آئین اسلامی نظریات کے مطابق مرتب کیا جائے گا۔ اس پر ملک کے علماء حضرات' پھر اپنی اپنی فقہ اور اپنی اپنی روایات کے ہتھیار لیتے ہوئے یہ اعلان کرتے نکل کھڑے ہوئے ہیں کہ آئین' اسلام کے متعلق ہماری تشریح کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔۔۔ یعنی وہی مطالبہ جس کی رُو سے' نہ گزشتہ چوبیس سال میں کوئی متفق علیہ آئین مرتب ہو سکا ہے' نہ آئندہ مرتب

ہوسکیگا۔ ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ آئین ساز کمیٹی بھی اسی روش پر اپنی سلامتی محسوس کریگی جسے ان کے پیش روؤں نے اختیار کیا تھا یعنی وہ بھی اتنا کہہ کر آگے بڑھ جائے گی کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا" اور اس کی عملی تعبیر میں جو سرپھٹول ہوگی اسے بننے والوں کے لئے چھوڑ دیگی کہ وہ نپٹتے رہیں۔ آئین ممکن العمل ہو یا نہ ہو، آئین سازوں کے لئے یہ راستہ بڑا محفوظ ہے۔ قارئین کو مودودی صاحب کا یہ اعلان یاد ہوگا کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قابلِ قبول ہو۔ لیکن اس کے باوجود مطالبہ پھر یہی ہے کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا — خود فریبی یا ابلہ فریبی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

ہمارا مسلک اس باب میں واضح ہے۔ یعنی آئین کی اساس قرآن کریم کے غیر متبدل اصول ہونے چاہئیں۔

(۲)

دنیا میں بعض حوادث آفاقی ہوتے ہیں جن پر انسان کو کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ یا یوں کہیئے کہ انسان ان پر آہستہ آہستہ قابو پا رہا ہے۔ مثلاً زلزلے، سیلاب، آندھیاں، جھکڑ، وبائی امراض، یا ہندو جیسی کمینہ قوم کی ہمسائیگی وغیرہ۔ لیکن بعض مصیبتیں انسان کی خود پیدا کردہ ہوتی ہیں جن کا خارج میں کوئی علاج ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی شخص نے کمرے کے اندر سے کنڈی لگا رکھی ہو اور رو رہا ہو کہ میں باہر کیسے نکلوں۔ انتظم ونسق مملکت اور آئین سازی کے سلسلہ میں ہم بھی ایک اسی قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، اور روتے جا رہے ہیں۔ آپ اپنی آئین سازی کی تاریخ، اور ملک میں برپا کردہ ہنگاموں پر نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس چٹان سے ٹکرا کر یہ کشتی ٹوٹتی ہے اور اس سے جو تلاطم خیزیاں برپا ہوتی ہیں، وہ ہے مرکز اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ۔ مملکت کی بہبود ایک مضبوط مرکز کی متقاضی ہوتی ہے، اور صوبے زیادہ سے زیادہ خود مختاری (AUTONOMY) چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ "پراونشل اٹانومی" سے آگے بڑھتے بڑھتے، مرکز سے علیحدگی اور کامل آزادی کی حد تک جا پہنچ جاتے ہیں، اور اس کے بعد وہ تباہی مچتی ہے جس کا خونچکاں منظر ہم مشرقی پاکستان میں دیکھ چکے ہیں۔

لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ یہ "صوبے" بالآخر ہیں کیا بلا، جو اس طرح وبالِ جان بن کر ہم سے چمٹ رہے ہیں کہ ہماری حالت یہ ہو رہی ہے کہ — نہ نکالا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔

جب انگریز نے ہندوستان کو اپنا محکوم بنایا تو اس نے دیکھا کہ اتنے وسیع وعریض ملک کا، جو ملک نہیں بلکہ ایک برِاعظم ہے، ایک وحدت (ONE UNIT) کی حیثیت سے نظم ونسق مشکل ہے۔ اس نے اسے انتظامی سہولت کی غرض سے، مختلف قطعات میں تقسیم کر دیا۔ ان قطعات کا نام "صوبے" (PROVINCES) رکھا گیا۔ چونکہ انگریز کی حکومت وحدانی انداز (UNITARY FORM) کی تھی اس لئے اس میں نہ مرکز اور صوبوں میں تقسیم اختیارات کا سوال پیدا ہوا نہ حکومت اس کشمکش میں مبتلا ہوئی۔ اس میں اختیارات کلی مرکز کے ہاتھ میں رہتے اور صوبے، مرکز کی ہدایت کے مطابق، اور اس کی زیر نگرانی، مقامی نظم ونسق کی ایجنسی رہتے۔ جب وہ یہاں سے جانے لگا تو مرکز اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم کا شوشہ چھوڑ گیا۔

ہم نے جب پاکستان کا مطالبہ کیا تو وہ مطالبہ مختلف صوبوں کا نہیں، ایک خطۂ ارض کا مطالبہ تھا جس میں ہم اپنے نظریۂ حیات کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔ ہم نے یہ خطۂ زمین حاصل کیا تو (بدقسمتی سے) اس شوشے کو بھی ساتھ لیتے آئے جسے انگریز اس مقصد کے لئے چھوڑ گیا تھا کہ یہ ملک، اُسے یہاں سے نکال دینے کے بعد ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھنے پائے۔ وہ شوشہ درحقیقت ایک چنگاری تھی جسے وہ جاتا، ہمارے بھس میں ڈال کر خود دور جا کھڑا ہوئی تھی۔ ہم نے اس چنگاری کو اس قدر ہوا دی

سمجھا کہ پارسیوں کے آتش کدہ کی آگ کی طرح اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی بجھنے نہ دیا ــــ نہ صرف یہ کہ اُسے بجھنے نہ دیا بلکہ اُسے دن بدن ہوا دیتے چلے گئے تاآنکہ اس نے شعلۂ جوالہ بن کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم ان شعلوں پر تو پانی چھڑک رہے ہیں لیکن آتشکدہ کی ان لکڑیوں کی جان دے کر بھی حفاظت کر رہے ہیں جو ان شعلہ سامانیوں کی بنیاد ہیں۔ وہ لکڑیاں جنہیں انگریز نے انتظامی سہولت کے لئے ملک کے نقشے پر کھینچا تھا، اب بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، پشتو نی کے جداگانہ، مستقل وجود کی بنیادیں بن چکی ہیں۔ یہ امواجِ مضطر اپنے اپنے جداگانہ تشخص کی نمود کے لئے اس شدت سے ابھر رہی ہیں کہ ان کی شورش انگیزیوں میں ملت کا سمندر غائب ہی ہو چکا ہے۔ ان صوبائی تفریقات کے دیوانانیت اس بدمستی سے مصروفِ رقص ہیں کہ ان کی اڑائی ہوئی دھول میں مرکز بیچارے کا وجود ہی گم ہو رہا ہے۔ ان کی نفسا نفسی اور خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ (غالب کے الفاظ میں)

بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

قوم مٹتی ہے تو مٹے، لیکن ہم باقی رہیں۔ مملکت جاتی ہے تو جائے لیکن ہم قائم رہیں ــــ اور یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ جب قوم مٹ گئی تو تم کہاں باقی رہو گے جب مملکت ہی نہ رہی تو تمہارا وجود کیسے قائم رہ سکے گا۔ وہ نشۂ اقتدار (کے تصور) سے اس قدر مدہوش ہو رہے ہیں کہ اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ:

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

دوسری طرف، دانشورانِ ملت بھی مغرب کی ذہنی غلامی میں اس شدت سے گرفتار ہیں کہ وہ ان کے سیاسی تصورات سے ذرا سا بھی ہٹ کر سوچنا جرمِ عظیم سمجھتے ہیں۔ یہ بھی انہیں کے قبیلے میں ڈیماکریسی، پارلیمانی اور پریذیڈنشل فارم، فیڈریشن اور کانفیڈریشن کے چکر میں الجھے رہتے ہیں اور اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان سے ہٹ کر کوئی اور نظام بھی وضع کیا جا سکتا ہے جو ہمارے مخصوص تقاضوں کو پورا کرے۔ اس سے آگے بڑھتے تو اعلان ہوتے چلے جاتے ہیں کہ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس لئے ہمارا آئین اسلامی نظریے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد کوئی طے نہیں کرتا کہ اسلامی نظریہ ہے کیا اور اس کے مطابق آئین کے حدود و امتیازات کیا ہوں گے۔ مثلاً کے نزدیک مرد کو چار بیویاں کرنے کی اجازت اور عورت سے حقِ طلاق سلب کر لینے کا نام اسلام ہے جس آئین اور ضابطۂ قوانین میں اس قسم کی شقیں درج ہوں، وہ اسلامی ہو جاتا ہے۔ "مسٹر" آئین کی شقِ اوّل میں یہ لکھ کر کہ کائنات میں اقتدارِ مطلق خدا کو حاصل ہے، مطمئن ہو جاتا ہے کہ آئین کے اسلامی ہونے کا تقاضا پورا ہو گیا۔ اس کے بعد آئین میں، مذہبی فرقہ بندیوں، سیاسی پارٹیوں، نسلی گروہ بندیوں (جو اب صوبجاتی تفریق کا دوسرا نام ہے) کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ ان کے فروغ اور تقویت کا پورا پورا سامان مہیا کیا جاتا ہے، اور کوئی نہیں سوچتا کہ یہ گروہ بندیاں اور فرقہ داریاں، اسلام کی رُو سے کفر اور شرک کے مرادف ہیں۔ قرآن کی رُو سے ایک امت، ایک مملکت، ایک مرکز، ایک ضابطۂ قوانین جو وحیٔ خداوندی پر مبنی ہو، اسلامی آئین کے بنیادی اور لاینفک تقاضے ہیں۔ کوئی آئین، کوئی نظام جس میں امت کی وحدت پر زد پڑے، کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ حتےٰ کہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

وحدت ہو فنا جس سے، وہ الہام بھی الحاد

لہٰذا اسلامی آئین کے اس تصور کی رُو سے مرکز اور صوبوں میں کشمکش کا کیا سوال اور صوبوں کے مطالبۂ اختیارات کے کیا معنی؟ لیکن ہمارے ہاں صوبوں اور مرکز میں تقسیم اختیارات کے سلسلہ میں اسی قسم کی جنگ جاری رہتی ہے۔ گویا صوبوں میں کوئی اور قوم بستی ہے اور مرکز میں کوئی اور، اور یہ دونوں متحارب قومیں، لنگر لنگوٹ کس کر ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہیں حالانکہ ان دونوں گروہوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک ہی ملک، ایک ہی قوم سے کہ ایک ہی پارٹی کے کچھ افراد منتخب ہو کر مرکز میں پہنچ جاتے ہیں اور دوسرے افراد صوبائی اسمبلی میں۔ اسلام تو خیر بہت دور کی چیز ہے، کیا یہ تصور مضحکہ انگیز نہیں کہ ایک ہی پارٹی کے افراد مرکزی اور صوبائی اسمبلی کے لئے منتخب ہو کر ایک دوسرے کے حریف بن جائیں!

یہ ہیں ان صوبوں کے وجود کے عملی نتائج جن کی حیثیت ذہنی لکیروں سے زیادہ کچھ نہیں اور جنہیں انگریز اس لئے نقشے پر کھینچ گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے پیہم اور مستقلاً لڑتے رہیں۔ کتنی گہری تھی اُس شاطر کی یہ چال اور کتنے سادہ لوح واقع ہوئے ہیں ہم جو اُس کی اِس چال کو اب تک نہیں سمجھ سکے!

(۷)

جس طرح ہم نے اپنا سیاسی نظام انگریز سے ورثہ میں لیا، اسی طرح معاشی نظام بھی ہیں اسی کے ترکہ سے ملا۔ اور جس طرح ہم اس نظام کے ہاتھوں مصائب میں مبتلا ہیں، اسی طرح اس معاشی نظام کے صدقے بھی عذاب میں گرفتار ہیں۔ اور تماشہ یہ کہ جس طرح ہم اپنی ان مشکلات کا حل، جو ہمارے اس سیاسی نظام کی پیدا کردہ ہیں، اُسی سیاسی نظام میں تلاش کرتے ہیں، اُسی طرح ان مصائب سے رستگاری، جو اس معاشی نظام کا نتیجہ ہیں، اُسی معاشی نظام کی رُو سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مغرب کا معاشی نظام جسے نظامِ سرمایہ داری کہہ کر پکارا جاتا ہے، خون آشامی کا دوسرا نام ہے۔ اقوامِ مغرب نے اس ہوسِ خوں آشامی کی تسکین کے لئے، کمزور قوموں کو تلاش کیا۔ ان ممالک میں براہِ راست اپنی حکومت قائم کی، یا اپنی تجارتی منڈیاں جمائیں۔ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا۔ یعنی ان اقوام کے خون سے اپنی قوم کے چہرے کی سرخی کا سامان فراہم کرنا۔ جب وہ ان ممالک سے جانے لگے تو (اپنے سیاسی نظام کے ساتھ) یہ معاشی نظام بھی انہیں ورثہ میں دے گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں تعلیم اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر بنا گئے۔ تن آسانیوں کا سارا سامان انہی ممالک سے آنا تھا جو انہیں "آزاد" کر کے گئے تھے۔ لہٰذا یہ ممالک بدستور ان کی مصنوعات کی منڈیاں بنے رہے۔ یہ سامان خریدنے کے لئے روپیہ ان کے پاس تھا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ہم تمہیں قرضہ دیتے ہیں۔ اس سے یہ مال خرید لیا کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم ان ممالک کے اربوں روپے کے مقروض ہیں، اور اس پر کروڑوں روپے سالانہ سود ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ ممالک ہمارے معاشی استحصال ہی سے مطمئن نہیں، وہ ہمیں اپنا سیاسی غلام بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ قرضہ دینے کے لئے ایسی شرائط عاید کرتے ہیں جن سے ہماری آزادی سلب ہو کر رہ جائے۔ یہ ہے وہ مقام جس پر انہوں نے ہمیں لا کھڑا کیا ہے۔ یعنی ناقابلِ برداشت قرضوں کی گرانباری، سامانِ زیست اور اسبابِ تحفظ کے لئے ان کی محتاجی، اور ان کی طرف سے مزید قرضہ کے لئے (جسے ابلہ فریبی کی خاطر "امداد" کہہ کر پکارا جاتا ہے) ایسی شرائط جن سے ہمیں اپنی عزت، غیرت، حمیت، شرافت سمیت کہ آزادی تک ان کے پاس رہن رکھنی پڑے۔ ہماری یہ حالت ہمارے دورِ غلامی سے بھی بدتر ہے۔ اُس زمانے میں ہماری آزادی دوسروں کے ہاتھ گروی تھی تو کم از کم، قفس کے پرندے کی طرح ہمارے دانہ پانی اور حفاظت کی ذمہ داری تو صیاد کے سر پر عاید تھی۔ لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ:

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر

ہماری یہ حالت اُن گوشوں میں ہے جن کا تعلق دوسری اقوام سے ہے۔ جہاں تک (نظامِ سرمایہ داری کی پیدا کردہ) جونک خون آشامی کا تعلق ہے، اس کی تسکین کے لئے کوئی غیر قوم ہمارے قابو میں نہیں آتی، اس لئے ہم اپنی ہی قوم کا خون چوس کر اس کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم نے کس قدر عظیم حقیقت کا انکشاف کیا ہے جب بتایا ہے کہ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں تھے تو ایک غیر قوم (قومِ فرعون) ان کا خون چوستی تھی۔ لیکن جب وہ آزاد ہوئے، تو ان کا خون چوسنے والا خود اسی قوم کا ایک فرد تھا۔ إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ (۲۸/۷۶) قارون خود موسیٰ کی قوم میں سے تھا (پہلے اس قوم کو غیر قوم دباتی تھی لیکن اب) اسے خود اسی قوم کا فرد کچل رہا تھا۔ ہمارے یہ قارون (یعنی قوم کا سرمایہ دار طبقہ) اشیائے ضروریہ کی قیمتیں بڑھا بڑھا کر، عوام کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لینے کی فکر میں ہیں، اور دوسری طرف حکومت کے واجبات کی ادائیگی سے گریز کی راہیں تلاش اور تراش کر، جسدِ مملکت کو بھی جونکوں کی طرح چمٹے ہوتے ہیں۔ یہ سب عوارض نظامِ سرمایہ داری کے فطری نتائج ہیں لیکن ہماری ذہنی غلامی کی یہ کیفیت ہے کہ ہم اس نظام سے الگ ہٹ کر کچھ سوچنے کی ہمت ہی اپنے اندر نہیں پاتے۔ حکومت کا خزانہ خالی ہوتا ہے تو مزید ٹیکس عاید کر دیئے جاتے ہیں اور ہر نیا ٹیکس یا قانون، رشوت ستانی کا نیا دروازہ بن کر رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ سال کے بعد حکومت دیکھتی ہے کہ جس قدر ان ٹیکسوں کی وصولی پر خرچ آیا، آمدنی اس سے بھی کم ہوتی ---- اور اس کا علاج؟ کسی بیرونی ملک کے دروازے پر نئے قرضے کے لئے دستک، یا اپنے ہاں ایک نئے ٹیکس کا اضافہ۔ اسے انگریزی زبان میں کہتے ہیں (VICIOUS CIRCLE)۔ یعنی قرضوں اور ٹیکسوں سے افلاس بڑھا، اور افلاس دور کرنے کیلئے ایک اور قرضہ اٹھا لیا، یا نیا ٹیکس عاید کر دیا۔

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی ہمیں
بزم سے ہم آرزوئے دیدِ جاناں لے چلے

قرآن کریم نے، ان تمام مشکلات کا ایک ہی حل بتایا ہے ---- یعنی پرائیویٹ پراپرٹی (ذاتی جائیداد) کا خاتمہ۔ اس کے تجویز کردہ معاشی نظام کی رو سے، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا مملکت کے ذمہ ہوتا ہے اور افراد میں سے کسی کے پاس زاید از ضرورت روپیہ رہتا نہیں۔ اس لئے اس میں ذاتی جائیداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ---- نہ زمین کی شکل میں، نہ جائیدادوں کی شکل میں، نہ کارخانوں کی شکل میں ---- یہ ہے اسلام کے معاشی نظام کا ماحصل، اور جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ مملکتِ پاکستان کا نظام اسلامی ہوگا، تو اسلامی نظام اس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ یاد رکھیئے۔ یہ جو ہمارے "علمائے کرام" اس نظام کو غیر اسلامی کہتے ہیں، تو ان میں سے جو دیانتدار ہیں ان کی بھول یہ ہے کہ انہوں نے قرآنی نظام کے بجائے اس نظام (سرمایہ داری) کو اسلامی سمجھ رکھا ہے جو ہمارے عہدِ ملوکیت کی پیداوار ہے لیکن جس نے ملوکیت کی سحرکاری کی بدولت، اسلامی لبادہ اوڑھ لیا تھا ---- اور ان میں سے، جو اس حقیقت کو جانتے ہیں، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ سرمایہ داروں کے آلۂ کار ہیں۔ ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہ تکرار و اصرار، شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس مقام پر ہم صرف اتنا دہرا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ:

اسلامی زندگی کا مکمل اور احسن نمونہ حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ ہے اور دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا (بلکہ یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا) کہ

حضورؐ کے پاس کوئی ذاتی جائیداد تھی یا حضورؐ نے کوئی جائیداد یا نقد دولت اپنے ترکہ میں چھوڑی تھی۔

اس عظیم ترین شہادت کے بعد، یہ ثابت کرنے کے لئے اور کونسی دلیل یا شہادت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اسلام میں ذاتی جائیداد کی اجازت نہیں۔ اس میں سب کچھ مقبوضۂ خدا کی ملکیت ہوتا ہے اور عملاً اس امت کی تحویل میں رہتا ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی کے نفاذ کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے۔ امت کے اس نظام کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔

اپنے ہاں یہ نظام رائج کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہم بھک منگوں کی صف سے نکل کر کس طرح "غنی عن العالمین" و "مستغنی عن الکل" کی صفتِ خداوندی کے مظہر اور خیر الرازقین کے شرف کے حامل نہیں بنتے؟

(۰)

ہماری خود پیدا کردہ مشکلات کی اگلی کڑی شیخ مجیب الرحمٰن کا مسئلہ ہے۔ مملکت کی کوئی دوسرے درجہ کی شخصیت نہیں بلکہ خود صدرِ مملکت، ایک بار نہیں متعدد بار اعلان کر چکے ہیں کہ یہ شخص غدار اور باغی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کے غدار اور باغی ہونے کا اعلان صدرِ مملکت کریں، اور محشرستانِ مشرقی پاکستان کے قیامت خیز واقعات اس کی زندہ شہادت ہوں، اس کے مجرم ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ لیکن قوم کو اس باغی اور غدار کے متعلق اس وقت تک اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ کسی بنگلہ میں فروکش، باغبانی کے مشغلہ سے اپنا دل بہلا رہا ہے۔ شیخ مجیب کی موجودگی ملک و ملت کے لئے جن تباہ کن خطرات کا موجب بن سکتی ہے وہ کوئی ڈھکے چھپے نہیں۔ بڑی بڑی پاکستان دشمن طاقتیں اس کی پشت پر ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ اس سے مصالحت کر کے، زمامِ اقتدار اس کے حوالے کی جائے۔ ان کی طرف سے یہ دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ چونکہ قوم کو کچھ معلوم نہیں کہ اس شخص کے متعلق کیا کیا جا رہا ہے اور کیا کیا جائے گا، اس لئے ملک میں گوناگوں افواہوں کے لئے فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ مشرقی پاکستان میں حالت اس سے بھی زیادہ خدوش ہے۔ وہاں کا جو طبقہ دل سے مجیب کا ہمنوا تھا وہ امید لگائے بیٹھا ہے کہ مجیب واپس آ جائیگا۔ اس لئے وہ دلی رضامندی سے قوم کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا۔ جو طبقہ دل سے اس کے خلاف تھا وہ بھی کھل کر اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا کہ اگر کل کو وہ واپس آ گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔

ہم ارباب حکومت سے گزارش کرینگے کہ اس مسئلہ میں اب مزید تاخیر نہ کی جائے۔ قوم اس کا فیصلہ سننے، اور اس کا انجام دیکھنے کے لئے ہمہ تن انتظار اور وقفِ اضطراب ہے۔ باغی کی سزا (قرآن کریم اور قانون مملکت دونوں کی رُو سے) موت ہے۔ اس باغی کی موت خود مملکت کی حیاتِ تازہ کا موجب ہوگی۔　　(نوشتہ ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء)

(۰)

طلوعِ اسلام کا یہ شمارہ اگست کا ہے۔ اس اگست کا جس کی آج سے چوبیس سال پہلے ۱۴ تاریخ کو قوم آزادی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ قوم کے لئے اس سے بڑا جشن کا دن اور کون سا ہو سکتا ہے۔ لیکن جن حالات سے ہم دوچار ہیں، ان میں جشنِ مسرت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب تو ضرورت اس کی ہے کہ اس دن قوم کا ہر فرد اس کا عزم کرے کہ ہم اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرینگے۔ اگر ہمارا یہ عزم راسخ ہوا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہماری آزادی کو کسی قسم کی زک نہیں پہنچا سکتی۔

ہم ۱۴ اگست ۱۹۷۱ء کی تقریب پر کچھ لکھنے کے بجائے قارئین کو یہ بتانا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم نے ۱۴ اگست ۱۹۵۱ء کو کیا لکھا تھا۔ یہ تحریر چند صفحات آگے چل کر سامنے آجائے گی۔

عالمی تاریخ میں یہ خبر بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ امریکہ کو بالآخر چین کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے، اور صدر نکسن نے اعلان کر دیا کہ وہ چین جائینگے۔ امریکہ جس تیزی سے اپنی فرعونیت میں آگے بڑھتا جا رہا تھا، اس سے دنیا کا ہر امن پسند منتقس لرزاں و ترساں تھا۔ امنِ عالم کو تباہ کرنے کے لئے وہ تنہا ہی کچھ کم دھاک روس کے ساتھ اس کے گٹھ جوڑ نے اس کیلئے کونیم چڑھا بنا دیا۔ دنیا کی باقی قومیں اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر سمجھتی تھیں۔ اس کی رعونت اور استکبار کا یہ عالم تھا کہ وہ چین جیسی عظیم مملکت کو بھی اپنی غلام گردش میں دیکھنے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن چین کی کیفیت یہ تھی کہ ــــ بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی ــــ وہ اس سے خائف ہونا تو ایک طرف، اسے پرکاہ جتنی بھی وقعت نہیں دیتا تھا۔ اور اس کا یہی عزم و وقار اور خود اعتمادی و خود نگہی تھی جس کے سامنے فرعونِ امریکہ کو بالآخر جھکنا پڑا۔

یہ وہی چین ہے جو ابھی کل تک "افیونیوں کی بستی" کے نام سے متعارف تھا۔ اور دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی طاقت بھی اسے خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں وہاں موجودہ انقلابی حکومت قائم ہوئی اور بیس بائیس سال کی قلیل ترین مدت میں جو قوموں کی زندگی میں لمحے البصر سے زیادہ نہیں ہوتی، اس نے یہ مقام حاصل کر لیا کہ اب ساری دنیا کی آنکھیں اس کیطرف لگ رہی ہیں، اور یوں نظر آتا ہے گویا انسانیت کا مستقبل اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ یہ حیرت فروش انقلاب کیسے آیا؟ اس کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہاں کے چند بے لوث لیڈروں نے اپنی بلند تی کردار سے قوم کا اعتماد حاصل کیا اور قوم کو سیکڑوں کٹھالیوں سے گزار کر ایسا کندن بنا دیا کہ وہ آزادی کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ہاں وہ معاشی نظام رائج کیا جو نظامِ سرمایہ داری کا حریف ہوتے اور اسے شکست دینے کی پوری پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس نظم کی بے لوث پختہ کار قیادت، اس نظم کی آہن گداز قوم اور اس انداز کے مستغنی عن الغیر معاشی نظام کا فطری نتیجہ چین کا یہ محیر العقول انقلاب ہے۔ وہ اپنے نظریات میں اس قدر پختہ اور ان کی صحت پر ایسا یقینِ محکم رکھتا ہے کہ روس جیسی مہیب قوت نے بھی ان سے ذرا سا انحراف برتا تو اس نے اسے "مرتد" قرار دیکر نہ صرف یہ کہ اس سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے بلکہ اس کی کھلی ہوئی مخالفت مول لے لی۔ اس نے اس باب میں نہ کسی نظم کی مفاہمت سے کام لیا، نہ مداہنت سے۔ نہ مصالحت کو اپنی سپر بنایا نہ منافقت کو۔ اس سے ہمیں پرویز صاحب کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انہوں نے یکم نومبر ۱۹۶۵ء کو "پاک چائنا فرینڈشپ سوسائٹی" کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے کہ:

> اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو چین، اپنی مخالفت میں روس کے ساتھ منافقت نہیں برتتا، وہ اپنی دوستی میں بھی ہم سے منافقت نہیں برتیگا۔ اس لئے اس کی دوستی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اور واقعات نے بتا دیا کہ چین کی دوستی واقعی قابلِ اعتماد ہے۔ اسی سے یہ امید بھی بندھی ہے کہ امریکہ کے مقابلہ میں چین کی یہ خیر سگالی کامیابی پاکستان جیسے صلح جو ملکوں کے لئے، نوید امن ثابت ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے، چین کے ساتھ خیر سگالی کے روابط قائم کرنے میں جن ارباب اختر و اقتدار کا ہاتھ تھا، انہوں نے بڑی دور نگہی سے کام لیا۔ قوم ان کے اس حسن تدبر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ فی الحقیقت قوم کے محسن تھے۔

لیکن جہاں تک ہماری بصیرت ہماری راہ نمائی کرتی ہے، چین کا یہ مقام اور اس کا یہ مسلک، اس کی موجودہ قیادت تک ہے، اور اس قوم کی جانفروشانہ قربانیاں، اس کی، اپنے محبوب قائد ماؤزے تنگ کی ذات سے بے پناہ عقیدت کی بنا پر ہیں۔ اسی سے ان کا موجودہ معاشی نظام بھی اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اس کے بعد ہمیں خدشہ ہے کہ چین کی حالت بھی روس جیسی ہو جائے گی، کیونکہ جس طرح اس گراں بار معاشی نظام کے لئے کوئی اساسِ محکم روس کے ہاں نہیں ملتی، اسی طرح چین بھی اس اساس سے محروم ہے۔

یہ اساس، قرآن فراہم کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پیپلز پارٹی اپنے دعویٰ "اسلامی سوشلزم" میں سچی ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ ہنگاموں سے الگ ہٹ کر، چین کے سوشلسٹ نظام کا، وہاں بر سرِ زمین جا کر گہری نظر سے مطالعہ کرے، اور پھر سوچے کہ اسے قرآن کی اساسِ محکم کس طرح عطا کی جا سکتی ہے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا اور پاکستان میں اس قسم کا نظام رائج ہو گیا، تو کوئی عجب نہیں کہ کل جب "دیوارِ چین" میں دراڑیں پڑنے لگ جائیں، تو اقوامِ عالم کی قیادت پاکستان کے حصہ میں آجائے۔ آج یہ بات تبسم خیز بلکہ مضحکہ انگیز سی نظر آئیگی لیکن قرآن میں یہ کچھ کر دکھانے کی صلاحیت آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے موجود تھی۔ بہرحال، سرِ دست ہم نے یہ دیکھنا کہ امریکہ چین کی اس خوشگوار تعلقات کا اثر بھارت پر کیا پڑتا ہے۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ ہمیں چین کی دوستی پر اعتماد ہے اور اگر امریکہ اسکے زیرِ اثر آگیا تو یہ چیز عالمگیر امن عامہ کے لئے نیک فال ہوگی، تو ہمارا یہ اندازہ چین کے گزشتہ کردار اور موجودہ اندازِ سیاست پر مبنی ہے، لیکن جن قوموں کا وحی کی راہنمائی پر ایمان نہیں ہوتا ان کے فیصلوں کے متعلق حتمی طور پر کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب بدل جائینگے۔ اسلئے کہ اُن کے فیصلے اپنے مصالح کے تابع ہوتے ہیں اور قوموں کے مصالح ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ وحی انسانوں کو غیر متبدل اصول دیتی ہے جن میں کسی کی مصلحت کے ماتحت کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جو قوم وحی کی راہنمائی کو اپنی سیاست کی اساس قرار دے لے اور اس کے مطابق عمل کرے، اسکے متعلق پورے اعتماد اور بھروسے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں معاملے میں کیا کریگی، بعینہٖ اسی طرح جس طرح یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ کل سورج کتنے بجے طلوع ہوگا۔ اسی کو اساسِ محکم کہا جاتا ہے۔

———— (٠) ————

کاپیاں پریس میں جا رہی ہیں اور پیپلز پارٹی کے صدر مسٹر بھٹو نے صدرِ مملکت کی ۲۸ جون کی تقریر کے متعلق اپنی پارٹی کے تاثرات یا ردِ عمل کا ابھی تک اعلان نہیں کیا۔ آخری خبر یہی ہے کہ صدرِ مملکت سے اُن کی طویل ملاقات ہوئی ہے اور اُنکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جو اجلاس راولپنڈی میں ہو رہا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ ابھی تک یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ ان کی طرف سے اس قسم کے اعلان کا اعادہ نہیں ہوا کہ یا تو ہمیں تو فوری اقتدار حاصل ہوگا یا ہم جیل میں ہونگے۔ اس وقت ہمارا ملک جس نازک ترین بحران سے گزر رہا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ فضا میں کسی قسم کا اشتعال پیدا نہ ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے لئے یہی راہِ صواب کی ہوگی کہ وہ صدرِ مملکت کے پروگرام کا نہایت پُر امن طریقے سے ساتھ دیں اور اس دوران میں ملک کو بھارت کی طرف سے پیش آنیوالے امکانی خطرات سے متنبہ کرتے جائیں اور قوم کو اس کیلئے تیار کریں کہ اگر ادھر سے کوئی پیشقدمی ہو تو ساری قوم اسکا مقابلہ بنیانِ مرصوص کی طرح کریگی۔ جہاں تک آئندہ متشکل ہونیوالی حکومتوں کا تعلق ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چیز ملکی مفاد کے لئے بڑی مساعد ہوگی، اگر مرکزی حکومت میں پیپلز پارٹی کی حیثیت مؤثر ہو۔ اس لئے کہ شعبہ امورِ خارجہ بہرحال مرکز کی تحویل میں رہیگا اور بھارت اور چین کے سلسلے میں جس قدر واضح پالیسی پیپلز پارٹی کی ہے کوئی دوسری جماعت اُس کی مثال نہیں پیش کر سکی۔

لیکن ہمیں یہ چیز کچھ مخدوش سی نظر آتی ہے اس لئے کہ (کالعدم) عوامی لیگ کے اُس عنصر کے متعلق جس کے سلسلے میں مسٹر بھٹو اور صدرِ مملکت کا خیال ہے کہ انہوں نے سابقہ ہنگاموں میں مجیب کا ساتھ نہیں دیا تھا، مسٹر بھٹو کہتے ہیں کہ جس کلن سے کام کیوں نہ لیں ہمیں توقع نہیں کہ وہ دل سے مسٹر بھٹو کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اسلئے کہ ان لوگوں کا خیال یہی ہے کہ ان کی آزاد مملکت کے وجود میں آنے کے راستے میں سب سے بڑا روڑا بھٹو ہی نے اٹکایا تھا۔ مسٹر بھٹو کا اوّلاً مستقر مغربی پاکستان ہے اور اسی سے اُن کے سیاسی پروگرام کا مستقبل وابستہ ہے۔ بنا بریں، مغربی پاکستان کے رہنے والوں کے جو جذبات مجیب اور اس کے ساتھیوں کے متعلق ہیں انہیں نظر انداز کر دینا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ بہرحال، پیپلز پارٹی سے ہمارا مشورہ یہی ہے کہ وہ اس وقت ہر قسم کے اشتعال سے بچے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے اسکے اس مقام کو ذرا سی بھی زد پہنچے جو اسے مغربی پاکستان میں حاصل ہو گیا تھا۔

———— (٭) ————

۱۴ اگست کی یاد میں

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

(بیس سال پہلے کی بات)

تشکیلِ پاکستان کے بعد، چند سالوں تک، ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم ہر سال ۱۴ اگست کے جشنِ آزادی کی تقریب پر قوم کے سامنے ایک آئینہ رکھا کرتے تھے تاکہ وہ اس میں دیکھ سکے کہ اس نے حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران اور اس کے بعد کن دعاوی کا اعلان اور کن عزائم کا اظہار کیا تھا اور اس وقت تک اس نے انہیں پورا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے جشنوں کی تقاریب پر ہم نے جو محاسبہ خویش کیا تھا، اسے ہم ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۰ء میں طلوع اسلام کے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ اشاعتِ حاضرہ میں ہم اس محاسبہ کو (بہ ادنیٰ لفظی تغیر) پیشِ خدمت قارئین کرتے ہیں جسے ہم نے ۱۹۵۱ء کے جشنِ آزادی کی تقریب پر حوالۂ قلم کیا تھا۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ آج سے بیس سال پہلے ہم کس مقام پر کھڑے تھے، ہماری مشکلات کیا تھیں اور ان کے حل کرنے کے لئے ہمارا پروگرام کیا۔ اور اس کے بعد دیکھیں کہ اس بیس سال کے عرصہ میں ہم نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔ اور آج ہماری حالت کیا ہے؟ اگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اس سطح سے بھی نیچے گر گئے ہیں جس پر ۱۹۵۱ء میں تھے، تو اس کے بعد سوچئے کہ اس رفتار سے ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟

غالبؔ نے چیخ کر کہا تھا کہ

زاں نمی ترسم کہ باشد قعرِ دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروزِ من فردائے من

یعنی میں اس سے نہیں ڈرتا کہ فردائے قیامت مجھے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ ڈرتا اس سے ہوں کہ کہیں میرا (آنے والا) کل ایسا ہی نہ ہو جیسا میرا آج (امروز) ہے۔ اور اس نکتہ نامرض کے لئے اس نے کسبِ ضیا کیا تھا حضورؐ کی اس حدیث سے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ

جس کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں (یعنی اس کا آج اس کے گزشتہ کل سے بہتر نہ ہو) سمجھ لو کہ وہ تباہ ہو گیا۔

لیکن اس کے بعد آپ سوچئے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو کہ

آج اس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو،

اس کا مستقبل کیسا ہوگا؟

اس تمہید کے بعد آپ دیکھئے کہ آج سے بیس سال پہلے ہماری حالت کیا تھی۔

(۰)

جشنِ آزادی

(شائع شدہ - طلوع اسلام، بابت اگست ۱۹۵۱ء)

جب حضور نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ عاشورہ (دسویں محرم) کا روزہ کس تقریب کی یاد میں رکھا جاتا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس روز بنی اسرائیل نے فرعون کی محکومیت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ اس لئے یہ دن ایسا ہے جس کی یاد قائم رکھنا ضروری ہے۔

جس مسلمان کا یہ عالم ہے کہ وہ دوسری قوموں کے یومِ آزادی کی یاد کو قائم رکھنا بھی اپنے لئے فریضہ سمجھتا ہے، وہ خود اپنی آزادی کے دن کی یاد کو کس طرح بھلا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں، وہ دن جب وہ محکومیت کے عذاب سے نجات حاصل کریں، سب سے بڑے جشن و مسرت کا دن ہوتا ہے۔ ایسا جشن جس سے دلوں میں شگفتگی، روح میں بشاشت نگاہوں میں تازگی اور ذہنوں میں جلا پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس قوم کے افراد کے اندر شرفِ انسانیت کا احساس بیدار ہو جاتا ہے جس سے وہ یہ کہنے میں بہزار فخر محسوس کریں کہ ہم دنیا میں کسی انسان کے سامنے نہیں جھکتے، ہماری تقدیریں ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ ہم اپنے شب و روز کے آپ مالک ہیں، ہم اپنے حال کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارتے ہیں، ہم اپنے مستقبل کے سانچے اپنے پیمانوں کے مطابق آپ ڈھالتے ہیں، ہم خوب و ناخوب کا فیصلہ اپنے اندازوں سے کرتے ہیں، ہم اشیائے کائنات کی اقدار اپنے معیاروں کے مطابق متعین کرتے ہیں۔ ہم اپنے فیصلوں میں کسی کے چینِ جبیں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ارادوں پر کسی کے اندازِ ابرو کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ ہم اپنی نیند سوتے ہیں اور اپنی نیند جاگتے ہیں۔

ہدیہ تبریک

خوش بخت ہے وہ قوم جسے یہ کچھ کہنے کی سعادت نصیب ہو جائے اور خوشتر از ہزار عید ہے وہ دن جو اس کے لئے اس آزادی کا پیغام لے کر آئے۔

سرزمینِ پاکستان کے رہنے والوں کے لئے ۱۴ اگست کا دن، اسی جشنِ آزادی کا دن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہمایوں بخت ساعتیں جو آج سے چار سال پہلے ان کے لئے پیامِ حریت لائیں اور مسعود و میمون ہے وہ طلعت جو اس نویدِ حیات بخش و نشید نشاط آور کی مورد و مہبط بنی۔

ہم اس مسعود و مبارک ساعت کی یاد میں تمام باشندگانِ پاکستان کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں اور مملکتِ پاکستان کے لئے دست بدعا ہیں کہ

الٰہی بخت تو بیدار بادا ۔۔۔ ترا دولت ہمیشہ یار بادا

(۰)

لیکن یہ آزادی جہاں سرور و انبساط کی ایک دنیا لئے سبک سیر اپنے جلو میں لاتی ہے، وہاں فرائض اور ذمہ داریوں کا کوہِ گراں بار بھی اس قوم کے سر پر مسلط کر دیتی ہے۔ فطرت کی عنایات بے خراجانہ بے مزد و معاوضہ نہیں ملتیں جس قدر کوئی متاع عزیز ہوتی ہے فطرت اسی نسبت سے اس کی قیمت بھی وصول کرتی ہے۔ قرآن کریم جو نوعِ انسانی کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد

کرانے کا انقلابی پروگرام اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو ایسے جامع اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے جس پر چشمِ بصیرت وجد کرنے لگ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ۔ جب اللہ کی طرف سے فتح و نصرت پیامِ حیات آور لائے۔
وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ اور لوگ فوج در فوج نظامِ خداوندی کے بہشت جاوداں میں داخل ہونے لگیں۔

جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو .....

اس "تو" کے بعد قرآن کریم نے ایسا پروگرام دیا ہے جس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے ــــ فرمایا۔ تو

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ ۔ وَاسْتَغْفِرْہُ ۔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔

سبِّح کے معنی ہیں ادائیگی فریضہ یا حصولِ مقصد کی جدوجہد میں، پوری قوت و توانائی سے سرگرداں پھرنا۔ جدوجہد و سعی و عمل تا حدِ استطاعت، تگ و تاز تا بحدِ امکان (UTMOST STRUGGLE)۔ یہیں سے "تسبیح" کے معنی سمجھ میں آجائیں گے جو اب دانے گننے کے کام آتی ہے۔

اب آگے بڑھیئے کائنات میں ہر شے کے دو پہلو ہیں۔ ایک جمالیاتی (AESTHETIC) یا (APPRECIATIVE) پہلو اور دوسرا افادی (UTILITAREAN)۔ افادی پہلو پرورش کا ذریعہ بنتا ہے اور جمالیاتی پہلو جذباتِ لطیفہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ عام طور پر افادی پہلو کو ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے لے کر آہستہ آہستہ بتدریج تکمیل تک پہنچانا جیسے پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں، گہر آبدار بن جاتا ہے۔ اللہ کی صفتِ ربوبیت اس کے قانونِ ربوبیت کی مظہر ہوتی ہے اور جب یہی صفتِ خداوندی انسانوں کی اس جماعت میں مرتسم ہوتی ہے جو اپنے معاشرے کی بنیاد اس کے قانون پر رکھتی ہے، تو وہ جماعت تمام افرادِ انسانیہ کے فطری جوہروں کی کامل نشو و نما کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔ اسی نسبت سے اس جماعت کو "ربانیون" (رب والوں کی جماعت) کہا جاتا ہے۔

ربوبیت ربوبیت کے مقابلہ میں دوسرا گوشہ جمالیاتی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں (APPRECIATION) کہتے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت ربوبیت ہی کا ایک گوشہ ہوتا ہے۔ لیکن افادیت اور جمالیت کے تقابل کے لحاظ سے اسے جداگانہ طور پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا "بحمد ربک" کا صحیح مفہوم ہوا اس نظام کا قیام جس میں حمدیت اور ربوبیت کے دونوں گوشے حدود اللہ کے اندر ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔ یعنی اس حد تک اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ،

جب خدا کی فتح و نصرت آئے اور تم غیر خداوندی قوتوں کے پنجۂ استبداد سے نکل کر آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشا ہو تو اس وقت یہ سمجھ کر اطمینان سے نہ بیٹھ جانا کہ اب ہم منزل پر پہنچ گئے۔ اب کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ بلکہ اس وقت یہ سمجھنا کہ کام کا وقت ہی اب شروع ہوا ہے۔ اس کے بعد اپنی انتہائی قوتیں اس جدوجہد میں صرف کر دینا کہ اس نظام کے تابع بسنے والے تمام انسانوں کی صحیح صحیح پرورش ہو اور ان کی تمام صلاحیتیں اپنے اوجِ کمال تک پہنچ جائیں۔

فسبّح بحمد ربّک۔ یہ ہے حمدیت اور ربوبیت کے ساتھ خدا کی تسبیح۔ اور یہ ہے فریضۂ زندگی اس قوم کا جسے اللہ آزادی کی نعمت سے سرفراز کرے۔

اس کے بعد دو نکتے اور آتے ہیں۔ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔ بقائے صحت کے دو طریقے ہیں۔ ایک حفظِ

استغفار

ماتقدم (PREVENTIVE) اور دوسرا ازالۂ مرض (CURATIVE)۔ حفظِ ماتقدم کے معنی یہ ہیں کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے جسمِ انسانی ان عناصر کے حملوں سے محفوظ رہے جو خرابیِ صحت کا موجب بنتے ہیں۔ انہیں حفاظتی تدابیر کہا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام مغفرت ہے۔ (مغفر، اس لوہے کی ٹوپی (خود) کو کہتے ہیں جسے دشمن کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے پہنا جاتا ہے)۔ استغفار کے معنی ہیں حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا۔ واستغفرہ کا مطلب ہے قانونِ خداوندی کے ذریعے حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا۔

ازالۂ مرض (CURATIVE) کے معنی یہ ہیں کہ انسانی جسم میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، انہیں دور کر کے صحت کو پھر سے اس کی اصلی حالت پر لایا جائے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں توبہ کہتے ہیں۔ تائب کے معنی ہیں اس مقام پر لوٹ کر آنا جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا۔ انہ کان توابا کا مطلب یہ ہے کہ جہاں خدا کے قانون میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسانیت کو ان عناصر کے حملوں سے حفاظت میں رکھتا ہے جو اس کے لئے وجۂ تخریب بن سکتے ہیں، وہاں اس میں یہ استعداد بھی ہے کہ اگر کسی سبب سے خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں تو ان خرابیوں کا ازالہ کر کے انسانی معاشرہ کو پھر سے صحیح حالت پر لے آئے۔

اب اس پوری سورت کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اس قابل ہو جاؤ کہ اپنے معاشرہ کو قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل کر سکو (کہ مسلمان کے نزدیک آزادی سے یہی مراد ہے۔ اس سے کم یا مختلف اور کسی چیز کا نام آزادی نہیں) تو اس کے بعد اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل ہو جاؤ جس کے لئے یہ آزادی ملی ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی فطری صلاحیتوں کی کامل نشوونما (ربوبیت) کا پورا پورا انتظام ہو، جس میں جسمانی پرورش اور شرفِ انسانیت کے تمام تقاضے شامل ہیں۔ اس نظامِ ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام تدابیر اختیار کی جائیں جن سے یہ نظام خارجی معاندانہ حملوں سے ہر طرح محفوظ رہے اور اس کے ساتھ ہی داخلی خرابیوں اور کوتاہیوں کا بھی ازالہ ہوتا رہے۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح۔ ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا۔ فسبح بحمد ربک۔ واستغفرہ انہ کان توابا۔

(۰)

یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن نے اس قوم کے لئے تجویز کیا ہے جو "خدا کے نام پر" آزادی حاصل کر لیتی ہے۔ مسلمانانِ پاکستان نے اپنی آزادی خدا ہی کے نام پر حاصل کی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ ہماری آزادی کا مفہوم اس آزادی سے یکسر مختلف ہے جس کے لئے ہندو کوشاں ہیں۔ ہم اس لئے آزاد ہونا چاہتے ہیں کہ ہم کلمۃ اللہ کو بلند کر سکیں، دنیا میں اسلام کا نام روشن کر سکیں۔ اپنی مملکت میں اپنے خدا کا قانون نافذ کر سکیں، اپنی زندگیاں خدائی سانچوں میں ڈھالنے کے قابل بن سکیں، ایک دفعہ پھر اس درخشندہ اور تابناک دور کو واپس لا سکیں جسے آسمان کی آنکھ نے ایک بار دیکھا ہے اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہیں۔ ہم نے یہی کہہ کر آزادی حاصل کی تھی اور اب بھی جس وقت ضرورت پڑتی ہے، ہم انہی دعاوی کا اعادہ کرتے اور انہی عزائم کو دہراتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم نے خدا کے نام پر آزادی حاصل کی ہے تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ حصولِ آزادی کے بعد آج تک ہم نے ان مقاصد کے حصول میں کیا کچھ کیا ہے جو خدا کے نام پر آزادی حاصل کرنے والوں کے لئے خدائی پروگرام نے متعین کر رکھے ہیں۔ اس مختصر سی صحبت میں اس طویل و عریض موضوع

پر سیر حاصل گفتگو کی گنجائش نہیں' اس لئے ہم اس کے بعض پہلوؤں پر طائرانہ نگاہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

دستور سازی

کسی مملکت کی تشکیل کے بعد سب سے پہلا اور بنیادی کام اس مملکت کا دستور (CONSTI-TUTION) مرتب کرنا ہوتا ہے کیونکہ دستور کے بغیر وہ سرزمین بے آئین رہتی ہے' اور دستور ہی ان تصورات کا آئینہ دار ہوتا ہے جو اس مملکت کی اساس ہوتے ہیں۔ اوروں کے لئے یہ مرحلہ دشوار ہو تو ہو، ایک اسلامی مملکت کے لئے اس باب میں چنداں دشواری نہیں ہونی چاہیئے اس لئے کہ قرآن نے وہ اصول خود ہی متعین کر رکھے ہیں جو ایک اسلامی مملکت کے دستور کے لئے بنیادی اصول (BASIC PRINCIPLES) قرار پاتے ہیں۔ اس مملکت کے واضعین دستور کے لئے فقط ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنے کا کام باقی رہ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں وضع دستور کیلئے کمیٹیاں تو ۱۹۴۹ء میں بٹھادی گئی تھیں لیکن "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کی رپورٹ تین سال کے بعد (سال گزشتہ) شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کی حقیقت کیا تھی' اس کا اندازہ اسی سے لگ سکتا ہے کہ سارے ملک میں اس کی مخالفت ہوئی اور بالآخر حکومت کو مملکت کے افراد اور اداروں سے سفارشات طلب کرنی پڑیں۔ اس سلسلہ میں اوروں نے جو کچھ کیا وہ تو الگ رہا، ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک جامع مسودہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصول دستور، خالص قرآن کی روشنی میں مرتب کرکے مجلس دستور ساز کے پاس، اواخر جنوری ۱۹۵۱ء میں بھیج دیا تھا۔ (یہ مسودات طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۵۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ لوگوں نے انہیں پمفلٹ کی شکل میں چھپواکر تقسیم کیا ہے۔)[۱] اس کے بعد مجلس مذکور کی طرف سے ادارہ طلوع اسلام کو کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کا مختصر سا اجلاس پھر ہوا تھا جس میں غالباً ان مسودات پر غور کیا جانا تھا جو ملک کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ ہم مجلس دستور ساز کی خدمت میں باادب گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں کسی لمبی چوڑی بحث و تمحیص اور کتر بیونت کی ضرورت نہیں۔ قرآن تمام مسلمانوں کے نزدیک آئین اسلام کا بنیادی ضابطہ ہے۔ اس لئے جو دستور خالص قرآن کے اصولوں کے مطابق وضع کیا جائے گا، اس پر کسی مسلمان کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ خارج از قرآن جو کچھ بھی ہے اس میں فرقہ وارانہ اختلاف ہوگا اور یقیناً ہوگا۔ اس لئے ان بنیادوں پر کوئی بھی ایسا دستور مرتب نہیں کیا جا سکتا جو سب مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوسکے۔ لہٰذا فیصلہ کرنے کی بات صرف اس قدر ہے کہ پاکستان کا دستور' دین کی بنیادوں پر ہوگا یا دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح عام سیاسی مصالح کے مطابق۔ اگر فیصلہ یہ ہو (اور ہمارا خیال ہے کہ قرارداد مقاصد کا مقصد یہی تھا) کہ دستور دین کے اصولوں کے مطابق ہوگا۔ تو اس باب میں ایک ہی راہ فلاح اور رشد کی ہے اور وہ راہ وہی ہے جس کی طرف طلوع اسلام کے مسودات میں راہ نمائی کی گئی ہے۔ یعنی مختلف شاخوں سے صرفِ نظر کرکے، جڑ کو پکڑ لیا جائے۔ دین کی جڑ، قرآنِ کریم ہے۔ لہٰذا پاکستان کا دستور قرآنی اصولوں کے مطابق مرتب کرلیا جائے۔ اس میں تھوڑی سی جرأت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے اربابِ حل و عقد نے اتنی سی جرأت کرلی تو اس کے بعد ملت کی گاڑی پھر اس پٹڑی پر چل پڑے گی جس پر وہ عہد محمد الرسول اللہ والذین معہٗ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) میں تھی۔ یہی وہ پٹڑی (صراطِ مستقیم) ہے جو ملتِ اسلامیہ کو امامتِ اقوام کی شاداب منزل تک لے جانے والی ہے اور جس میں نوعِ انسانی کی ربوبیت کا راز پوشیدہ ہے۔ لہٰذا "ضبط بعد ریلیف" کے پروگرام کی

۱؎ ان کا مجموعہ "قرآنی دستورِ پاکستان" کے عنوان سے الگ شائع ہوگیا ہے۔

یعنی کراچی، قرآنی اصولوں کے مطابق، دستور کی ترتیب و تدوین ہے۔

(۸)

پناہ گزینوں کا مسئلہ

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا مسئلہ "پناہ گزینوں[1]" کی بحالی کا تھا۔ جس طرح ایک بزرگِ خاندان (HEAD OF THE FAMILY) کا اولین فریضہ افرادِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا ہے، اسی طرح مملکت کا کام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا ہے۔ اگر کسی گھر کے بعض افراد مکان کے اندر عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہوں اور انہی جیسے دوسرے افراد باہر گلی میں پریشان حال پھر رہے ہوں، تو اس خاندان کے بزرگ کے متعلق جو کچھ اندازہ کیا جائے گا ظاہر ہے۔ اس باب میں اربابِ بست و کشاد اپنی جس قدر مشکلات بھی بیان کریں، ان کے بعد یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ہماری اصل مشکل اس لئے نہیں کہ ہمارے پاس ان خانماں برباد و تباہ شدہ حصۂ آبادی کے لئے ضروریاتِ زندگی کا سامان نہیں۔ ہماری مشکل کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اس کی تقسیم غلط ہو رہی ہے۔ اسی قسم کے مسئلے سے خود نبی اکرمؐ کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس کا حل، صحیح تقسیم کے ذریعے کر لیا اور نہایت کامیاب طریقے سے کر لیا۔ مکہ سے آنے والوں اور مدینہ میں رہنے والوں میں مواخات اور جو کچھ میسر آیا اس کی برابر برابر تقسیم، بس یہی اس مشکل کا حل تھا۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں قحط پڑا تھا تو اردگرد کی تمام آبادی سمٹ کر مدینہ میں جمع ہو گئی تھی۔ ابن سعد کی تحقیق کے مطابق ان "پناہ گزینوں[2]" کی آبادی کم از کم پچاس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ شاید یہ تعداد آج کچھ زیادہ نہ دکھائی دے، لیکن اس زمانے کو سامنے رکھئے، جب مدینہ خود ایک مختصر سی بستی تھی اور وسائلِ نقل و حرکت بے حد محدود تھے۔ اس وقت اس کا صحیح اندازہ ہو گا کہ یہ مسئلہ (PROBLEM) کس قدر پریشان کن اور صبر آزما تھا۔ اس دشوار گزار اور جانکاہ مسئلہ کو کس طرح طے کیا گیا؟ اسی صحیح تقسیم کے ذریعے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ جو کچھ کسی کے پاس تھا اور جو کچھ کسی کو میسر آتا، سب ایک جگہ جمع ہو جاتا اور ضروریات کی شدت اور اہمیت کی نسبت سے سب میں تقسیم کر دیا جاتا۔ خود امیر المومنین حضرت عمرؓ کی یہ حالت تھی کہ مسلسل جو کی روٹی کھانے سے انہیں سوءِ ہضم کی شکایت ہو گئی اور گھی کی بجائے زیتون کے تیل کے استعمال سے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقائے کار نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ بہتر غذا استعمال کریں۔ آپ کی صحت کی ملت کو از بس ضرورت ہے۔ آپ یہ سنتے تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست[3]

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دیکھا کہ آپ کا پوتا خربوزہ کھا رہا ہے۔ اپنے بیٹے (حضرت عبداللہؓ)

---

[1] اس اصطلاح کو استعمال کرتے وقت ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ برابر کے بھائیوں میں سے ایک کو مالک اور دوسرے کو پناہ گزین کہنا عدل و مساوات سے چشم پوشی اور حقیقت بینی سے عمداً اجتناب کی ایسی مثال ہے جو شاید ہی کسی اور جگہ مل سکے لیکن چونکہ ہمارے ان خانماں برباد بھائیوں کا تعارف انہی الفاظ سے ہو رہا ہے اس لئے ہم نے بھی بادلِ ناخواستہ یہی الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ کیا کریں ــــ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

[2] اسے تاریخ میں عام الرمادہ کہہ کر پکارا گیا ہے کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین اور اس کی تمام شادابیاں جل کر راکھ (رماد) ہو چکی تھیں۔

[3] اس تلمیح کے سلسلے علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرار و رموز ملاحظہ فرمائیے۔

کو بلایا اور کہا کہ دوسرے مسلمانوں کے ... روٹی کے ٹکڑے کے لئے ترس رہے ہیں اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟ اس کا کوئی جواب (EXPLANATION) تمہارے پاس ہے؟ انہوں نے کہا کہ بچے کو صبح کے وقت (عام بچوں کے ساتھ) جو کھجوریں کی گٹھلیاں ملی تھیں اس نے ان کے عوض ایک بدو لڑکے سے خربوزہ لے لیا تھا۔ یہ ہے حقیقت اس میوہ خوری کی! ورنہ عمرؓ کے گھر والوں کو بھی وہی کچھ اور اتنا ہی مل رہا ہے جو کچھ اور جتنا قحط زدہ مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی تفریق و تخصیص نہیں۔ یہ تھا احتیاط کا عالم! اور اس کے ساتھ ذمہ داری کے احساس کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق:

> قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ عشاء کی نماز پڑھا کر اپنے مکان میں داخل ہوتے اور آخر شب تک برابر نماز پڑھتے رہتے تھے۔ پھر نکلتے اور پہاڑی راستوں پر گھومتے تاکہ تمام لوگوں کی خبر گیری کریں) ایک رات میں نے انہیں یہ دعا کرتے سنا کہ اے اللہ! امتِ محمدیہ کی ہلاکت میرے ہاتھوں پر نہ کر۔ (طبقات ابن سعد)

وہ لوگوں کے غم میں اس قدر نڈھال تھے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کے بیان کے مطابق، صحابہؓ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر قحط رفع نہ ہوا تو عمرؓ مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے۔ اس تمام دوران میں حضرت عمرؓ نے اپنے لڑکوں یا بیویوں میں سے کسی کے گھر کچھ نہیں چکھا۔ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ انہی "پناہ گزینوں" کے درمیان بیٹھ کر، وہی کچھ کھا لیتے جو انہیں ملتا۔ حتیٰ کہ (حضرت صفیہ بنت ابی عبیدؓ کی روایت کے مطابق) اس تمام زمانے میں آپ اپنی بیوی کے قریب تک بھی نہ گئے۔ جب تک کہ لوگ خوشحال نہیں ہو گئے۔

لہٰذا ہماری دانشوری یہ نہیں کہ ہمارے پاس ان "پناہ گزینوں" کے لئے ضروریاتِ زندگی کی کمی ہے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے لیکن اس کی تقسیم غلط ہوتی ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

جب تک یہ تقسیم صحیح نہیں ہوتی، پناہ گزینوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور تقسیم صحیح ہو نہیں سکتی جب تک یہ احساس پیدا نہ ہو جائے کہ

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یہی وہ احساسِ امانت تھا جس کے پیشِ نظر حضرت ابوبکرؓ نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو حکم دیا تھا کہ ان کا مکان فروخت کر دیا جائے اور انہوں نے جو کچھ بیت المال سے لیا ہے، اسے واپس کر دیا جائے۔ اس لئے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جو کچھ مسلمانوں کے مال سے لیا ہے اس کے معاوضے میں ان کا کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ بہتر ہو کہ یہ حساب یہیں چکا دیا جائے تاکہ مجھے خدا کے حضور اس کا حساب نہ دینا پڑے۔"

یہ ہوتا ہے اسلامی مملکت کے اربابِ حل و عقد کا احساسِ ذمہ داری! اسی لئے جب حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ! تو جواب ملا تھا کہ اگر آپ مسلمانوں کے مال میں سے ایک درہم بھی ناحق خرچ کریں گے تو آپ بادشاہ ہیں ورنہ خلیفہ۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ اپنے گزارے کیلئے دو درہم روزانہ، اور سردی گرمی دو جوڑے کپڑے بیت المال سے لیا کرتے

تھے اور اس پر بھی ہمیشہ لرزہ بر اندام رہا کرتے تھے کہ کہیں یہ زیادتی تو نہیں!

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آج بھی دو درہم روزانہ کے وظیفے اور دو کپڑوں میں گذارہ کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب قوم پر اس قسم کی مصیبت آن پڑے جس سے آج پاکستان دوچار ہے تو اس کا علاج انہی تدابیر سے ہو سکتا ہے جنہیں حضرت عمرؓ نے اختیار کیا تھا اور جن کی رو سے جو سب سے بڑا تھا اس کا متاعِ حلی میں سب سے کم حصہ تھا کہ

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے

مسلمانانِ ہندوستان

"پناہ گزینوں" کے ساتھ ہی خیال مسلمانانِ ہند کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

اس لئے کہ یہ دونوں درحقیقت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں اور ایک ہی مرثیے کے دو بند ہیں۔ یہ ابتداء کے لئے ہے وہ انتہاء کے لئے۔ ان بیچاروں کی حالت ایسی ہے کہ اسے بیان کرنے کے لئے جب قلم اٹھایا جائے تو سینے میں دل لرز جاتا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے دوران، اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے متعلق ہماری دلیل یہ ہوتی تھی کہ پاکستان میں بھی اقلیتیں موجود ہیں، اس لئے ان کا وجود، ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا ضامن ہوگا۔ لیکن تقسیمِ ہند کے بعد حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ہماری یہ دلیل لاطائل ہو کر رہ گئی۔ اب وہاں کے مسلمانوں کی حالت وہ ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْوِلْدَانِ۔ وہاں کے مرد، عورتیں اور بچے جنہیں طرح طرح کے مظالم سے کچل کر ناتواں بنا دیا گیا۔ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ رہ رہ کر پکارتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! کوئی ایسا سامان پیدا کر دے کہ ہم اس ملک سے نکل سکیں جس کے رہنے والوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ اور انکی نگاہیں بصد حسرت و یاس آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور انتہائی ناامیدی کے عالم میں کہتی ہیں کہ ہمارا یہاں کوئی یار و مددگار نہیں۔ اس لئے اے چارہ سازِ بے چارگاں! تو کسی کو ہمارا چارہ ساز بنا کر بھیج دے تو کسی کو ہماری یاوری پر آمادہ کر دے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم یہاں سسک سسک کر مر جائیں گے۔ یہی تھے وہ مسلمان جن کے لئے اللہ نے ان کے ہمسایہ (مدینے کے) مسلمانوں کو جنہوں نے اس نے حکومت و مملکت سے نوازا تھا، کہا تھا کہ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے ان مظلوم و مقہور بھائیوں کی فریاد پر لبیک کہتے ہوئے شمشیر بکف اُٹھ نہیں کھڑے ہوتے!

آج ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ یہی ہو چکی ہے۔ ان کے لئے وہاں زندگی حرام کر دی گئی ہے اور باہر نکلنے کی راہیں مسدود ہیں۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ہمارا اُن کے لئے شمشیر بکف اُٹھ کھڑے ہونا تو ایک طرف، ان کے لئے دعائے خیر تک بھی ہماری زبانوں پر نہیں آتی؛ حتیٰ کہ اسلامی جماعت کی بارگاہِ امارت سے تو ان سوختہ سامانوں کے حق میں یہ فتویٰ بھی صادر ہو چکا ہے، کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات بھی ناجائز ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ

موجودہ حالات کے پیشِ نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصلی باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

اس کے جواب میں امیرِ جماعت نے اپنی مسندِ رشادت سے بیک جنبشِ قلم فیصلہ صادر فرما دیا کہ

"نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو ٹوٹ نہیں سکتا، لیکن زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہو اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جا سکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔

آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیئے۔" (ترجمان القرآن جون ۱۹۵۱ء)

یعنی یہ حضرات جو تحریکِ پاکستان کے دوران پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور قائدینِ تحریک کو گالیاں دیتے رہے، وہ تو آج اس قابل ہیں کہ حکومتِ پاکستان کی مسندیں ان کے حوالے کر دی جائیں، اور جن مسلمانوں کے سرمدِ تھے پاکستان وجود میں آیا ہے جو ابھی تک وہاں کے ہندوؤں کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، جن پر گوشۂ عافیت تنگ ہو چکا ہے، ان سے پاکستانی مسلمانوں کا رشتہ بیاہ بھی ناجائز قرار پا گیا! ہم ان حضرات سے (جنہیں دعویٰ یہ ہے کہ وہ خاص مزاج شناسِ رسولؐ واقع ہوئے ہیں اور جن کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہجرت کسے کہتے ہیں اور اس کے احوال و ظروف کیا ہوتے ہیں) اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ہندوستان کا مسلمان سخت ناتواں اور بے چارہ ہے اس لئے تمہارے تیر وستان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن ڈرو اس وقت سے جب اس کمزور و ناتواں مسلمان کا ہاتھ ہوگا اور تمہارا گریبان اور کوئی پوچھنے والا پوچھے گا کہ

بایِّ ذنبٍ قتلت

بالآخر کس جرم کی پاداش میں انہیں اس طرح قتل کیا گیا تھا؟ سوچو کہ اس وقت تمہارا کیا جواب ہوگا؟ لیکن یہ سوچے تو وہ جسے اس امر کا یقین ہو کہ ایک دن کسی پوچھنے والے کے سامنے جانا ہے۔

بہرحال انہیں چھوڑیئے اور اس مسئلہ کو سنجیدگی سے سوچئے کہ ہندی مسلمانوں کی طرف جو ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیر کیا ہے؟ اس حقیقت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تو ایک دو نسلوں کے بعد ان کا وجود بحیثیت مسلمان باقی نہیں رہے گا۔ جو آسانی سے ہندوؤں میں جذب ہونے پر آمادہ ہوں گے، انہیں ہندو بنا لیا جائے گا اور اس طرح وہاں اچھوتوں کا ایک جدید ورن پیدا کر لیا جائے گا۔ جن میں ذرا سختی اور صلابت ہوگی انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ اس باب میں ہندوؤں کے عزائم بالکل کھلے کھلے اور بے نقاب ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان مظلوم مسلمانوں کو وہاں سے نکال لیا جائے۔ ہمارے ہاں خدا کی دی ہوئی زمین بڑی وسیع ہے۔ اس کے اندر دفن شدہ خزانے بڑی بہت ہیں۔

انتقالِ آبادی

وہاں کا تین چار کروڑ مسلمان آسانی سے اس زمین پر بسایا جا سکتا ہے۔ پھر تبادلۂ آبادی کی رُو سے مشرقی بنگال میں قریب ڈیڑھ کروڑ ہندو بھی جگہ خالی کر دیں گے۔ اس لئے جہاں تک جگہ کا تعلق ہے، ہمارے ہاں کنجائش کافی ہے۔ اناج بھی ہمارے ہاں اتنا ہے جس سے اس زاید آبادی کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے اگر کچھ کمی پڑ جائے تو اور اناج اگایا جا سکتا ہے۔ وہاں کا کاشتکار طبقہ یہاں آسانی سے کھپ سکتا ہے۔ باقی رہا مزدور طبقہ تو ان کے لئے کارخانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس باب میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا سرمایہ دار طبقہ اس وقت ان طریقوں سے دولت کمانے میں مصروف ہے جنہیں قرآن نے میسرہ سے تعبیر کیا ہے (یعنی بلا محنت و مشقت کے دولت کما لینا۔) آپ کسی بڑے سرمایہ دار کے متعلق پوچھئے کہ وہ کیا کام کر رہا ہے، جواب ملے گا "امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس"

وہ "بزنس" جس میں نہ ہاتھ ہلانا پڑے نہ پاؤں۔ اور دولت چھما چھم چلی آئے۔ ساری تگ و تاز ایک لائسنس حاصل کرنے تک کی ہے۔ اس کے بعد دولت ہی دولت ہے۔ آپ سوچئے کہ اس طریق حصول دولت کو چھوڑ کر، کارخانے بنانے کی کون فکر کرے گا؟ جن میں خود مالک کو بھی مزدوروں کی طرح سر کھپانا پڑے۔ اس لئے ہماری تمام انڈسٹری ویسی کی ویسی دھری رکھی ہیں، خدا کی دی ہوئی ..... دولت بے شمار ہے جس چیز کی ضرورت ہوئی ولایت اور امریکہ آرڈر بھیج دیا۔ بنی بنائی چیز گھر آ پہنچی۔ بنانے کی زحمت کون گوارا کرے اور کیوں کرے؟

ان حالات کے پیش نظر، کامیابی کی صورت صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کہ حکومت انڈسٹری کو (NATIONALISE) کر لے۔ خود کارخانے کھولے اور اس باب میں کسی کی بات نہ سُنے۔ قوم کا روپیہ ملک کے اندر رہے گا اور کروڑوں کی بے کار آبادی کام پر لگ جائے گی اور اس طرح ہندوستانی مسلمان کے مسئلہ کا ایک حل بھی نکل آئے گا۔

لیکن ہماری دشواری یہ ہے کہ ہمیں پاکستان محض تقریرات اور بیانات کے زور سے مل گیا۔ اس لئے ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر مشکل کا حل تقریریں اور بیانات ہی ہیں۔ جب تک ہم اپنے آپ کو اس حسین فریب سے نہیں نکالتے، کشاد کی راہ ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے، ناداں نہ "جل ترنگ"

تقریروں کے "جل ترنگ" سے میدان فتح نہیں ہو سکتے۔ یہاں تو کچھ کرنے ہی سے کچھ ہو سکے گا۔

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

سامانِ پرورش

کسی مملکت کا پہلا فریضہ، افرادِ مملکت کے سامانِ پرورش کی دیکھ بھال ہے۔ "پرورش" میں جسمانی پرورش اور ذہنی تربیت دونوں آجاتی ہیں۔ اسی لئے قرآن نے "جسم اور علم" دونوں کی توانائی اور وسعت کو معیار سیادت قرار دیا ہے۔ سردست ہمارے زیر نظر جسمانی پرورش کے سامان کا مسئلہ ہے۔ ذہنی تربیت کا سوال ذرا آگے چل کر آئے گا۔) ایک اسلامی مملکت میں جس کا دستور قرآن کے اصولوں پر متشکل ہو، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کی تمام تر ذمہ داری خود مملکت کے سر ہوتی ہے۔ لیکن غیر قرآنی مملکتوں میں بھی ضروریاتِ زندگی کی کفالت نہ سہی، ان کی دیکھ بھال تو مملکت کے ذمہ یقیناً ہونی چاہیئے۔ ذرا مغربی اقوام کو دیکھئے۔ وہ افرادِ مملکت کے سامان خورد و نوش اور اسبابِ بود و ماند کے متعلق کس قدر حزم و احتیاط اور نگہداشت سے کام لیتی ہیں، اس لئے کہ وہ جانتی ہیں کہ قوم کی زندگی کا دار و مدار افرادِ قوم کی صحت و توانائی پر ہے اور صحت و توانائی ماحصل ہوتی ہے سامانِ خورد و نوش اور اسبابِ بود و ماند کا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سب کچھ "اللہ توکل" ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنا کسی کا کام (CONCERN) ہی نہیں کہ لوگوں کو کیا کچھ کھانے کو ملتا ہے اور کس طرح ملتا ہے؟ وہ کہاں رہتے ہیں اور کیسے رہتے ہیں؟ ان کی صحت کیسی ہے۔ اور کیوں ایسی ہے؟ بچوں کی نشو و نما ہو رہی ہے یا نہیں؟ وہ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے قابل بن رہے ہیں یا نہیں؟ کسی کو ان سوالات سے کچھ علاقہ نہیں۔ آبادی کا بیشتر حصہ کو

ایسا ہے جنہیں ضروریات زندگی یا تو ملتی ہی نہیں، یا ملتی ہیں تو بہت کم مقدار میں۔ اور جو کچھ ملتا ہے وہ قطعاً وہ نہیں ہوتا جو اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ دودھ، گھی، مکھن، گوشت، پھل، ترکاریاں، اناج۔ یہی کچھ ہے جس سے انسانوں کے جسم بنتے ہیں۔ آپ پہلے یہ سوچئے کہ ملک میں کتنے افراد ایسے ہیں جنہیں یہ چیزیں ضرورت کے مطابق ملتی ہیں۔ پھر یہ سوچئے کہ جنہیں یہ چیزیں ملتی ہیں ان میں سے کتنے ہیں جنہیں یہ چیزیں فی الواقعہ وہی ملتی ہیں جو وہ خریدتے ہیں! آج کون کہہ سکتا ہے کہ جس "مرکب" کو گھی کہہ کر فروخت کیا جاتا ہے، اس میں کتنا حصہ گھی کا ہوتا ہے! کسے معلوم ہے کہ جس سیال، ابیض کو دودھ کہہ کر پکارا جاتا ہے، اس میں کتنی مقدار دودھ کی ہوتی ہے! کون بتا سکتا ہے کہ جس کو ہم آٹا کہہ کر اس سے تنور شکم جھونک لیتے ہیں اس میں کتنا جزء گیہوں کا ہوتا ہے؟ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا بجز ان سوکھے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچوں کے جنہیں کبھی انسانی جسم کہا جاتا تھا۔ اس زرد و زرد و بے رنگت کے جسے خون کی سرخی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ان تپلے تپلے، مردنی چھائے ہوئے حشرات الارض کے جن کا نام انسانی بچے ہوا کرتا تھا۔

پھر جس قیمت پر یہ چیزیں ملتی ہیں، ان کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ آپ کوئی چیز خریدیئے، یہ دوکاندار کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ اس کی قیمت کیا مانگ لے؟ جو اس کے جی میں آئے مانگ لے! آپ اس چیز کا حساب پھیلا کر دیکھئے۔ بمشکل ایک روپیہ لاگت بیٹھے گی اور وہ پانچ روپے مانگ رہا ہوگا۔ اور آپ کو یہ دام دینے پڑیں گے۔ ملک میں اس کا کوئی انتظام نہیں کہ بازاروں میں فروخت کیا ہو رہا ہے اور اس کی قیمتیں کیا چارج کی جاتی ہیں؟ باقی رہا "خدا" کا خیال، سو اس کے ایجنٹوں نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور تجارت کو حلال۔ اس لئے آپ سود نہ لیجئے (اور لیجئے تو اس کا نام سود نہ رکھئے۔ اسے منافع کہئے) اور تجارت میں جس قدر منافع آپ چاہیں حاصل کیجئے، یہ سب حلال و طیب ہے اور شیر مادر کی طرح جائز۔ لوٹیئے اور جی بھر کر لوٹیئے۔ لیکن اس لوٹ میں "اللہ میاں" کو ضرور شامل کیجئے۔ اس کا حصہ نکال کر ہمیں دے دیجئے ہم اس تک پہنچا دیں گے۔

چلئے دنیا اور آخرت دونوں میں خلاصی ہو گئی۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح قوم کتنے دن جی سکے گی؟ قوم کے بڈھے بوڑھے تو خیر، پرانی ہڈیاں اپنے ساتھ لائے ہیں، وہ کسی نہ کسی طرح رینگتے سسکتے، دن پورے کر جائیں گے۔ سوال ان بچوں کا ہے جنہیں کل کو "مملکت اسلامیہ پاکستانیہ" بننا ہے، کیا ہمیں اس امر کی کچھ بھی فکر ہے کہ یہ کے دن جئیں گے اور جتنے دن جئیں گے کس حالت میں جئیں گے! سوچئے کہ یہ باتیں بڑی گہری سوچ کی طالب ہیں! بچوں کی پرورش کا مسئلہ کس قدر اہم ہے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے لگایئے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اسلامی مملکت میں ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کے لئے تمام

حضرت عمرؓ کا انتظام

افراد کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ جس دن سے بچہ دودھ پینا چھوڑتا اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا۔ ایک رات حضرت عمرؓ حسب معمول گشت لگا رہے تھے کہ ایک خیمے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے جا کر بچے کی ماں سے کہا کہ اسے چپ کراؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر بچے کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے پھر جا کر کہا۔ جب دو تین مرتبہ ایسا ہوا تو آپ نے بچے کی ماں سے ڈانٹ کر پوچھا کہ بات کیا ہے؟ بچہ سوتا کیوں نہیں؟ اس عورت کو کیا معلوم کہ پوچھنے والا کون ہے۔ وہ خود بچے کے رونے سے تنگ آ چکی تھی۔ اس نے (ہمارے ان کی بولی میں) جواب دیا کہ بچہ رو رہا ہے عمرؓ کی جان کو! آپ نے کہا کہ بچے کے رونے میں عمر بیچارا کیسے آ گیا؟ اس عورت نے کہا کہ عمرؓ نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ بچے کا وظیفہ اس

دن سے شروع ہو جس دن وہ دودھ چھوڑتے ہیں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں اور یہ روتا ہے، سوتا نہیں! پوچھنے والا بغیر ایک لفظ کہے واپس آگیا۔

مدینہ کی مسجد میں صبح کی نماز ہو رہی ہے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ امام ہیں۔ مقتدی دیکھتے ہیں کہ نماز پڑھاتے پڑھاتے حضرت عمرؓ ہچکیاں لے کر رونے لگے ہیں۔ ان کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ نماز کے بعد سب پریشان ہو کر آپ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ روتے جاتے ہیں اور فقط اتنا کہتے ہیں کہ یا اللہ عمر کو معاف کر دینا۔ معلوم اس کے ہاتھوں کتنے بچوں کا خون ہو چکا ہے۔ اس کے بعد فوراً منادی کراتے ہیں کہ ہر بچے کا وظیفہ اس کی پیدائش کے بعد ہی شروع ہو جائیگا۔

یہ تھی ان لوگوں کی نگاہوں میں بچوں کی قدر و قیمت اور ان کی پرورش کے بارے میں احتیاط، جو جانتے تھے کہ آج کے بچے کل کی قوم بننے والے ہیں۔

(۰)

تعلیم

جسمانی پرورش کے ساتھ ہی ذہنی تربیت کا سوال وابستہ ہے۔ اسے تعلیم کہتے ہیں۔ تعلیم کی اہمیت کے متعلق اس سے زیادہ اور کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ جس قسم کی تعلیم آپ اپنے بچوں کو آج دینگے اسی قسم کی قوم کل کو تیار ہو جائے گی۔ اگر آپ انہیں تعلیم دیں گے ہی نہیں تو قوم جانوروں اور وحشیوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مدینہ میں تشکیل مملکت کے بعد پہلی جنگ (بدر) کے قیدیوں کے فدیہ کا سوال پیدا ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ ان میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں وہ دس دس بچوں کو تعلیم دیں۔ یہی ان کا زر فدیہ متصور ہوگا۔ ولایت میں یہ حالت ہے کہ تعلیم لازمی ہے۔ لیکن جو بچے اپاہج ہیں اور کسی صورت میں بھی اسکولوں تک نہیں پہنچ سکتے، اساتذہ ان کے گھروں پر جا کر تعلیم دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں چھوٹے چھوٹے مقامات کو تو چھوڑیئے، حکومت کے دارالسلطنت کراچی میں یہ حالت ہے کہ تعلیم کیسی ہونی چاہیئے تو بعد کا سوال ہے، ہزار ہا بچے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اسکولوں میں داخل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا حکومت سے یہ کہنا کہ بچوں کے لئے قرآنی خطوط کے مطابق تعلیم کا انتظام کرو، خواہ مخواہ اپنا مذاق اڑانا ہے۔

دہن کا ذکر کیا، واں سر ہی ناشب ہے گریباں سے

یوں تو بیانات اور تدبیری اعلانات (PLANNING SCHENES) کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی بھی دوسرے سے پیچھے نہیں، لیکن شعبۂ تعلیم نے اس سلسلہ میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ بہرحال ہم اس باب میں متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہم قوم کے سوچنے والے طبقے سے بار بار کہہ چکے ہیں کہ وہ کچھ دیر کے لئے یہی تصور کر لیں کہ وہ ہنوز اسی دور میں ہیں جس دور میں تقسیم ہند سے پہلے تھے۔ اگر ہم اس زمانے میں اپنی مفلسی اور ناداری کے باوجود مسلم یونیورسٹی اور انجمن حمایت اسلام لاہور جیسے ادارے بنا سکتے ہیں، تو آج اس خوشحالی کے دور میں اس قسم کے تعلیمی ادارے کیوں نہیں بنا سکتے جن میں ہمارے بچوں کے قلب و دماغ صحیح اسلامی سانچوں میں ڈھل سکیں! لیکن شاید اس کی وجہ ہماری خوشحالی ہی ہے کہ ہم آج کچھ نہیں کر سکتے، قوم کا خوشحال طبقہ، دولت سمیٹنے کی فکر میں بری طرح بدحواس ہو رہا ہے۔ اس سے کسی صحیح تعمیری کام کی توقع رکھنا عبث ہے۔ البتہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے مذہبی کاموں کے لئے "زکوٰۃ" نکال دیتے ہیں تاکہ ان کا باقی مال "پاک اور مطہر" ہو جائے۔ یہی وہ "زکوٰۃ" ہے جس سے مولوی صاحبان بڑے بڑے دارالعلوم تعمیر کر کے اپنے طبقے کی معاش کا انتظام کرنے کی فکر میں ہیں۔ حکومت بھی ان دارالعلوموں کی اسکیم سے مطمئن ہے، اس لئے کہ قوم میں جس قدر

نقدانِ عقل اور افلاسِ ہوش ہو، اسی قدر حکومت آسان ہو جاتی ہے۔

بہرحال، اس باب میں ہم قوم کے صاحبِ فکر و احساس طبقہ سے ایک بار پھر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ حکومت کے PLANS کی طرف نہ دیکھیں اور جس طرح سرسیدؔ مرحوم نے کیا تھا، قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم کا انتظام خود کریں۔ ورنہ جہاں گھی کی جگہ "بناسپتی مرہم" ان کے جسموں کو تباہ کر چکا، تعلیم کی جگہ جہالت ان کی روح کو کچل دے گی۔ اور پھر وہ نہ دین کے رہیں گے نہ دنیا کے اور اس طرح قرآن کے الفاظ میں قوم کی جڑ کٹ جائے گی۔ فقطع دابر القوم الذین ظلموا۔

یہ تو ہے مستقبل کے متعلق۔ لیکن موجودہ مسلمانوں کا مسئلہ ان سے بھی زیادہ توجہ طلب اور پریشان کن ہے۔ مُلّا کے غلط

نوجوانوں کا طبقہ

مذہب نے جو بے بنیاد اقدار اس وقت تک مقرر کر رکھی تھیں، زمانے کے تھپیڑوں نے ان اقدار کی ساکھ تک اڑا دی۔ لیکن ان اقدار کی جگہ صحیح اقدار قوم کے نوجوانوں کو نہیں دی جا رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ذہنوں میں خلاء واقع ہو رہا ہے اور چونکہ کارگہِ فطرت میں خلاء محال ہے اس لئے اس (TO LET) مکان کے اندر ناخواندہ کرائے دار گھسے چلے آتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس ذہن میں خدا نہیں ہوتا اس میں شیطان بسیرا کر لیتا ہے۔ اس لئے ہمارے نوجوانوں کے قلوب و اذہان بُری طرح غیر اسلامی تصورات سے متاثر ہو رہے ہیں اور وہ خدا فراموشی کی اس بڑھتی ہوئی رَو میں کشاں کشاں بہے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج نہ تو وہ خوفِ جہنم ہے جس سے انہیں مُلّا ڈراتا ہے، اس لئے کہ یہ نوجوان جنت اور جہنم کے "مذہبی" تصور سے پہلے ہی باغی ہو چکے ہیں۔ دین "اعیُنی" اسلام خطرے میں ہے" کا بگل اس رَو میں بہنے سے روک سکتا ہے، اس لئے کہ مُلّا نے اسلام کی جو تصویر ان کے سامنے پیش کر رکھی ہے، اس اسلام کو یہ نوجوان سرمایہ دارانہ ذہنیت کا پیدا کردہ تخیل سمجھتے ہیں اور اسے مُلّانے میں غریبوں کا اور مزدوروں کا مخالف خیال کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو اس سیلاب سے بچانے کی بڑی ضرورت ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے سامنے "قرآنی اسلام" پیش کیا جائے۔ اس باب میں ہمارا اپنا تجربہ ہمارے لئے بڑی تقویت اور یقین کا موجب ہے۔ ہم نے ایسے شوریدہ سر نوجوانوں کو دیکھا ہے جو ذہنی طور پر مروجہ اسلام سے یکسر کٹ کر علیحدہ ہو چکے تھے اور اپنے جدید تصورات میں بڑے پختہ معتقد اور بے باک واقع ہوتے تھے۔ ایسے بے باک کہ انہیں خدا، رسول، وحی، آخرت کے نام تک سے چڑ تھی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا گیا تو ان کا تمام انکار و جحود، اقرار و ایمان میں بدل گیا اور ان کی سرکشی اور عناں تابی تسلیم و انقیاد میں تبدیل ہو گئی۔ لہٰذا انکار و سرکشی کی ان بڑھتی ہوئی طغیانیوں اور سیلاب انگیزیوں کی روک تھام کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ قرآن کو ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن قرآن سے مراد وہ قرآن نہیں جسے مسجدوں اور مکتبوں میں دہرا دہرا کر "ثواب" حاصل کر لیا جاتا ہے بلکہ وہ قرآن جو ہماری زندگی کے معاملات کو سنوارتا اور جن مشکلات سے آج دنیا دوچار ہے ان کا تسلی بخش حل بتاتا ہے۔ اس قسم کا نصاب بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ کسی کی نیت اور ارادہ ہو۔

لیکن اس سے ہم پھر اسی نقطہ پر آ پہنچے جہاں سے چلے تھے یعنی یہ کہ آج ضرورت ہے ایک ایسے "سرسیدؔ" کی جو قوم کا

سرسیدؔ کی ضرورت

نمائندہ بن کر قوم کے بچوں کے لئے صحیح تعلیم کا انتظام کرے اور اس کے لئے نہ حکومت کی امداد کا انتظار کرے نہ کسی آنے والے کا۔ اگر کچھ عرصہ تک ایسا نہ ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے عوام بالکل اسی انداز کے ہو جائیں گے جس انداز کے عوام دیگر ممالکِ اسلامیہ میں موجود ہیں۔ اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ایسے سرپھروں کی جماعت بن جائے گا جسے قابو میں رکھنا کسی کے بس کا نہ ہوگا۔ البتہ چند مخصوص خاندانوں کے نوجوانوں کی تعلیم اس

انداز کی ہوا کرے گی جو حکومت کی مسند پر سنبھال سکیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ریڈیو

دورِ حاضرہ میں ذہنی تربیت و تعمیر کا بہترین ذریعہ ریڈیو ہے۔ زندہ اقوام اس کے ذریعے قلب کے میلانات، ذہنی رجحانات اور نگاہوں کے زاویے بدل رہی ہیں۔ یہ ہے ریڈیو کا بنیادی مفہوم، ان اقوام کے ہاں۔ لیکن چونکہ انسانی طبائع ذہنی تربیت کے خشک ذرائع سے جلد اکتا جاتی ہیں، اس لئے انہوں نے اس ہوسٹ میں شگفتگی اور اس صلاحیت میں لوچ پیدا کرنے کے لئے، ساتھ ساتھ تفریح و تفنن کے پروگرام بھی شامل کر رکھے ہیں۔ لیکن وہ اس تفریحی پروگرام میں بھی اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے جس کے حصول کا ذریعہ ریڈیو کا شعبہ ہے۔ ہمارے ہاں ریڈیو کا بنیادی مقصد ہی تفریح سمجھ لیا گیا ہے اور اس پروگرام میں دوسری چیزیں محض تنوع پیدا کرنے کے لئے شامل کر لی جاتی ہیں۔ اگر یہ تفریحی پروگرام بھی ایسا ہو جس سے فی الواقعہ کچھ تفریح کا سامان بہم پہنچ جاتے تو پھر بھی انسان اسے گوارا کرے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے !

لیکن ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ جہاں تک صرف تفریح کا تعلق ہے، اس کے لئے بھی ہمارے ریڈیو اسٹیشن ایسا پروگرام پیش کرتے ہیں جس سے سعدی کا وہ قصہ یاد آجاتا ہے جس میں اس نے قوالوں کو اپنی پگڑی دے کر راگ سننے سے توبہ کی تھی۔ ہمیں اس پر ناز ہے کہ ہم نے مرکزی ریڈیو اسٹیشن کی ایک ایسی عمارت بنائی ہے جس کے مشمولات کا مقابلہ یورپ کے اسٹیشن نہیں کر سکتے۔ لیکن خالی عمارت سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو محض ایک نیام ہے زرنگار، بے شمشیر۔ اصل چیز تو وہ پروگرام ہیں جو آپ اس عمارت سے نشر کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے اربابِ حل و عقد کو اس حقیقت کا علم ہے یا نہیں کہ پاکستان کا صاحبِ ذوق طبقہ تفریحِ طبع (موسیقی) کے پروگرام کے لئے مجبوراً ہندوستان کا ریڈیو سنتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ہی وہاں سے اور بھی کیا کچھ نہیں سننا پڑتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ حقیقت ہمارے ہاں کے تفریحی پروگرام پر ایسی کھلی ہوئی تنقید ہے جس پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

لیکن ابھی اس موضوع کا ایک حصہ ایسا ہے جس کے تصور سے نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اور وہ ہے ہمارے ریڈیو کے درسِ قرآن کا پروگرام۔ ایک آزاد اسلامی مملکت کا ریڈیو اسٹیشن ہو اور اس سے قرآن جیسی پائندہ اور درخشندہ کتابِ زندگی کا درس نشر کیا جائے! اگر ان نشریات سے دنیائے قلب و ذہن میں انقلاب نہ واقع ہو جائے تو قرآن کیا ہوا؟

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

لیکن جو کچھ ہمارے ہاں سے ہر صبح نشر ہوتا ہے، خدا کرے کہ اسے کوئی ذی ہوش غیر مسلم سننے نہ پائے! اس درس کو نشر کرنے والوں سے تو کچھ کہنا ہی بے سود ہے۔ ہم صرف نشر کرانے والوں سے اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا انہیں اس کا بھی علم ہے کہ ان کی اس "مبارک و مسعود دینی خدمت" سے اس وقت تک کتنے نوجوانِ اسلام سے متنفر ہو چکے ہیں اور کتنوں کے دلوں میں اس کے خلاف بغاوت کے جذبات کی پرورش ہو رہی ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

لیکن انہیں اس کی خبر کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ ان کا معیارِ خوب و ناخوب عوام کے خطوط کے وہ طومار ہیں جو اس "درس شریف" کی حمد و ستائش میں ہر روز ریڈیو اسٹیشن میں موصول ہو جاتے ہیں۔ ہم ان سے اس باب میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ زندہ اقوام کے ریڈیو کا مقصد قلب و نگاہ کی تربیت و اصلاح ہوتا ہے، عوام کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتا۔ عوام بالعموم بہت نیچی سطح پر ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے ان کی سطح کے مطابق سامان فراہم کرتے رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی قوم کی سطح کو ذرا بھی بلند نہیں کرنا چاہتے۔

لیکن اگر اس کے باوجود، اربابِ حل و عقد اپنے مصالح کی بنا پر اس پر مصر ہیں کہ وہ عوام کے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہیں تو ہم باادب اتنی گزارش کریں گے کہ اس کے لئے تو ازکم قرآن کو ہدفِ ناوکِ جہالت تو نہ بنائیں۔ ہمارے متعلق اقوامِ عالم نے جو رائے قائم کر رکھی ہے وہ ہمیں معلوم ہے لیکن قرآن کے متعلق ابھی ان کے دل میں حسنِ ظن موجود ہے۔ خدا کے لئے ان کے دل میں وہ حسنِ ظن رہنے دیجئے۔ آپ کا مطلب تو "ثواب" حاصل کرنے ہی سے ہے۔ اس کے لئے سینکڑوں اور طریق بھی ہیں۔ انہیں اختیار کر لیجئے لیکن قرآن کی حالت پر رحم فرمایئے کہ یہ کتاب (بقول علامہ اقبالؒ) پہلے ہی بڑی "مظلوم" ہے۔

(۱۰)

رابطۂ عوام

اپنی اور غیروں کی حکومت میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی حکومت میں عوام حکومت کو اپنے سے الگ نہیں سمجھتے۔ اور غیروں کی حکومت میں حکومت اور عوام دو الگ الگ دوائر کا نام ہوتا ہے جن کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام چار برس سے مسلسل اس حقیقت کو دہرا رہا ہے کہ پاکستان میں کوئی اقدام ایسا نہیں کیا گیا جس سے عوام، حکومت کو اپنے سے الگ نہ سمجھیں۔ یہاں اربابِ حکومت کی دنیا الگ ہے اور افرادِ مملکت کی الگ۔ جلسے اور جلوسوں کی ہماہمی سے اپنے آپ کو دھوکا دے لینا الگ بات ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ حکومت اور عوام دو الگ الگ جزیرے ہیں، جن کا درمیانی فاصلہ کم نہیں ہو رہا (بلکہ دن بدن زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے)

تفرقہ

اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک یہ حقیقت ہے کہ آزادی ملنے کے بعد بجائے اس کے کہ ملت میں وحدت پیدا ہو جاتی، اس کے اور بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے جس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ حقیقت بڑی دل خراش اور جگر سوز ہے کہ آج ملت بری طرح سے پارٹیوں میں بٹ چکی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوتا ہے۔ ان پارٹیوں میں ہمارے نزدیک سب سے زیادہ نقصان رساں، اسلامی جماعت ہے جس نے جماعت کے ممبروں کے دل میں غیر ممبروں کے خلاف، جنہیں وہ "نسلی مسلمان" سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو "اصلی مسلمان"۔ اور اپنی جماعت کے سربرآوردگان کو صالحین کی جماعت) سخت جذباتِ نفرت پیدا کر رکھے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ سیاست جب بھی مذہب کا نقاب اوڑھ کر سامنے آتی ہے، اس کے نتائج و عواقب بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔

صوبائی تفریق

وحدتِ ملت کے ضمن میں ایک نقطہ ایسا ہے جس کی طرف اربابِ حکومت کی توجہ خاص طور پر مبذول ہونا ضروری ہے۔ ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری۔ اس حقیقت کو ہم میں سے ہر شخص دن میں دس بار دہراتا ہے کہ اسلام نسب، نسل، قوم، وطن، رنگ، زبان کے تمام انسان سوز امتیازات کو مٹا کر وحدتِ تکریم ۔ فقط جو ہر ذاتی تقویٰ

کو قرار دینا ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور قرآن کی نصِ صریح۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں دو رائے ہو نہیں سکتیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے، اس حقیقت کو اس طرح تسلیم کرنے والی اور بار بار دہرانے والی حکومتِ پاکستان نے عملاً کیا کیا ہے۔ انہوں نے مرکزی ملازمتوں میں صوبہ وار نیابت کا اصول نافذ کر رکھا ہے۔ ذرا سمجھ لیجئے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ مثلاً پاکستان کی اعلیٰ ترین سروس کا امتحان ہوتا ہے جس میں ایک سو امیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ ان امیدواروں کی ان کے حاصل کردہ نمبروں کے لحاظ سے فہرست مرتب کر لی جاتی ہے۔ اب عدل و مساوات اور جوہرِ ذاتی کے معیار کا تقاضا یہ ہے کہ اسامیوں کے مطابق نمبروار امیدوار منتخب کر لئے جائیں۔ لیکن کیا یہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ جاتا ہے کہ ان اسامیوں کو صوبہ داری نیابت کے لحاظ سے تقسیم کر لیا جاتا ہے اور اس کے مطابق امیدواروں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ مثلاً ایک سندھی لڑکا دسویں نمبر پہ ہے اور ایک بنگالی پچاسویں نمبر پر، تو اس سندھی کو چھوڑ دیا جائے گا اور بنگالی کو منتخب کر لیا جائیگا۔ غور فرمایئے کہ اس بنیادی بے اصولی کے نتائج کس درجہ دور رس اور تباہ کن ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مملکتِ پاکستان بہترین دماغوں سے محروم کر دی جاتی ہے اور ان کی جگہ کمتر قابلیت کے افراد، حکومت کی مشینری کے کل پرزے بنا لئے جاتے ہیں۔ سوچئے کہ جب دس بیس سال تک معیارِ انتخاب ایسا ہی رہا تو حکومت کی مشینری کس قسم کے عناصر پر مشتمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد دوسری طرف دیکھئے۔ جس اعلیٰ پوزیشن کے امیدوار کو نظر انداز کر کے، پست درجے کے امیدوار کو منتخب کر لیا گیا ہے، اس امیدوار کے دل میں حکومت کا کیا وقار باقی رہ جائے گا۔ اس کا سینہ عمر بھر کے لئے زندانِ شکایت بنا رہے گا۔ اور آگے بڑھیئے۔ فرض کیجئے کہ وہی بنگالی امیدوار دو چار سال بعد سندھ کے اسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر بن کر آ جاتا ہے جو اس امیدوار کا وطن ہے جس پر اسے ترجیح دی گئی تھی حالانکہ اس کا نمبر دسواں تھا اور اس کا پچاسواں۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اس سندھی امیدوار کا خاندان کبھی اس بنگالی ڈپٹی کمشنر سے تعاون کر سکیگا جو ان کے قابل اور ہونہار فرزند کا حصہ چھین کر ڈپٹی کمشنر بنا ہے اور ان کا لڑکا کہیں کلرکی کر رہا ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ اس صوبہ داری نیابت سے صوبائی عصبیت کی لعنت کس درجہ عمیق اور شدید ہوتی جا رہی ہے؟ اور چند سال کے بعد اس کی کیفیت کیا ہو جائے گی؟

کہہ دیا جائے گا کہ حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ بعض صوبے اس نیابت پر مصر ہیں کیونکہ وہ مقابلہ کی بنا پر ملازمتوں میں آ نہیں سکتے۔ اس لئے وہ نیابت کی راہ سے قصرِ حکومت میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اس باب میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ جو صوبے ان تمام مفاسدات کے باوجود جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اس طریقِ انتخاب پر اصرار کرتے ہیں وہ قطعاً پاکستان کے بہی خواہ نہیں۔ قوم حق رکھتی ہے کہ پوچھے کہ وہ کون سے صوبے ہیں اور ان کے کونسے نمائندے اس طرح کی تخریبی کوششوں پر مصر ہیں۔ یہ مسئلہ تمام ملت کا مشترکہ مسئلہ ہے اس لئے کہ اس سے پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس لئے کہ قوم کو کم از کم معلوم تو ہو کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس طرح کمزور کرنے اور ملت کو عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے کون سے "محبانِ ملت" ہیں۔

یاد رکھیئے! پورے کا پورا پاکستان ایک مملکت ہے۔ پاکستان کے تمام مسلمان ایک ملت ہیں۔ ان میں انتخاب کا معیار صرف جوہرِ ذاتی ہونا چاہیئے۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا نسب

اسی بنا پر ہم نے تحریک کی تھی کہ پاکستان کے صوبوں کو مٹا کر ساری مملکت کو ایک مرکز کے تابع لے آنا چاہیئے اور انتظامی سہولت کی خاطر ملک کو اسلئے بدلتے رہنے والے دائروں میں بانٹنا چاہیئے جن میں نسل، زبان، رنگ کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ لیکن بجائے اسکے کہ یہ کیا جاتا، صوبہ دار نیابت کے اصول سے صوبہ دارانہ گرہوں کو اور زیادہ کس دیا گیا تاکہ کوئی یہ نہ کہنے پائے کہ تمام مسلمان ایک ملت ہوتے ہیں۔

(۰)

مغالطہ

ایک اور بات ہے جس نے ہمیں مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد سے دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارا اختلاط زیادہ ہو گیا۔ (یہ امر موجب اطمینان ہے اس لئے کہ شاید اسی سے وحدتِ ملت اسلامیہ کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو کر حقیقت بن جائے جو ہمارے لئے وجہ سکون جان ہے) ہم جب اپنا مقابلہ ان ممالک سے کرتے ہیں تو اپنے آپ کو ان سے بہت آگے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہم اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم بہت ترقی یافتہ قوم ہیں اور ہم نے بہت کچھ کر لیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اول تو ان ممالک سے تقابل کے بعد اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھنا ہی غلطی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہماری یہ ترقی بھی ہماری کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ پاکستان کے ساتھ ورثہ میں آئی ہے۔ انگریز نے اپنے سو سالہ عہد حکومت میں (اپنے مقاصد کے لئے یا باشندگان ملک کی بہبود کی خاطر) ہندوستان میں بہت سی وہ چیزیں رائج کر دیں جو عربی ممالک کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔ ریل، تار، ڈاک، ٹیلیفون، پختہ سڑکیں، عمدہ بندرگاہیں، ہوائی اڈے وغیرہ۔ ان کی وجہ سے ہمارا ملک ان امور میں دیگر اسلامی ممالک سے آگے ہے۔ آئینی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی وجہ سے ہماری حکومتی مشینری میں وہ ابتری نہیں جو دیگر اسلامی ممالک میں پائی جاتی ہے۔ تعلیم کے لئے ہم مرہون کرم ہیں سرسیدؒ کی ان انتھک کوششوں کے جن کی وجہ سے ہم آج دنیا کی باتیں سمجھنے کے قابل ہو رہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے بھی دیگر اسلامی ممالک سے آگے ہیں۔ فکری اعتبار سے خدا کروٹ کروٹ جنت عطا کرے علامہ اقبالؒ کو جس نے ہمیں ایسی سرفرازی عطا کر دی ہے کہ ہمیں اور نہیں تو کم از کم مسلم اقوام کی فکری امامت کا شرف حاصل ہے اور اگر حکومت کی طرف سے ذرا بھی حوصلہ افزائی ہو تو ہم میں ایسے ایسے جوہر قابل موجود ہیں جو کسی اعتبار سے بھی مغربی مفکرین سے کم نہیں۔ باقی رہی ہماری آزادی سو وہ صدقہ ہے قائداعظمؒ (مرحوم و مغفور) کی سیاسی بصیرت اور تدبر کا۔ ان تمام امور میں ہماری کوششوں کا کوئی دخل نہیں۔

آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

لہٰذا اگر ہم آج اسلامی ممالک میں سب سے پیش پیش ہیں تو اس میں ہماری سعی و عمل کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں یا تو ورثہ میں ملا ہے یا حالات کا نتیجہ ہے۔ معاشی اعتبار سے ہماری خوشحالی، پٹ سن، روئی اور گیہوں کی وجہ سے ہے جو ہماری ریڑھ کی ہڈی کی کڑیاں ہیں۔ یہ بھی دایۂ فطرت کی کرم گستری ہے ہمارا کمال نہیں۔ وہ تو یوں کہیئے کہ ہمارے کاشتکار کو اور کوئی کام نہیں آتا جس کی وجہ سے وہ اس طرح سال بھر لہو پانی ایک کر کے اپنی محنتوں کا ماحصل ہمارے لئے وجہ تقویت و افتخار بنا لیتے ہیں۔ ورنہ ہمارے نظام زمینداری نے جو حالت ان کی بنا چھوڑی ہے اس میں ان کا زندہ رہنا بھی معجزہ ہے۔

(۰)

پاکستان کا تحفظ

ہم نے یہاں تک جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق یوں سمجھئے جیسے کسی خاندان کے افراد اپنے

بچے کی صحت، توانائی، تعلیم، مستقبل وغیرہ کے متعلق گھر میں بیٹھ کر صلاح اور مشورے کرتے ہیں۔ پاکستان، ہم سب افرادِ خاندان (مملکت) کا مشترکہ مفاد ہے جس کا تحفظ ہم سب کا یکساں فریضہ ہے۔ اس لئے اس میں نہ کسی کے سر پر کسی کا احسان ہے، نہ بڑا ماننے کی ضرورت۔ ایک بات البتہ ایسی ہے جسے ہم شروع سے بہ اصرار دہراتے چلے آ رہے ہیں اور وہ یہ کہ جہاں تک سرزمینِ پاکستان کے تحفظ کا سوال ہے اس میں کسی قسم کی کوتاہی، تقص، تساہل، یا تغافل کی اجازت نہیں دی جا سکتی، نہ اسے گوارا کیا جا سکتا ہے خواہ یہ افرادِ مملکت کی طرف سے ہو خواہ اربابِ حکومت کی جانب سے۔ اس باب میں ہم اہلِ پاکستان کی دشواری یہ ہے کہ ایک تو ہماری مملکت نوزائیدہ ہے، دوسرے شومئی قسمت سے ہمیں ہمسایہ ایسا ملا ہے جس کی تنگ نظری، حسد، کمینگی، کینہ پروری، بددیانتی، بدعہدی، کٹ حجتی، نامعقولیت اور بے اصولی ضرب المثل ہے۔ ایسے ہمسایہ سے واسطہ پڑنا ہزار مصیبتوں کی ایک مصیبت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا علاج جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی متعدد بار لکھ چکے ہیں، صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ صرف ایک مرتبہ انہیں ایسی شکست دی جائے کہ ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ خود بھی آرام اور چین سے بیٹھ جائیں گے اور دنیا بھی امن میں رہے گی۔ اس باب میں ہندوستان خود اس حد تک آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے کہ شاید پاکستان کیلئے جنگ کے سوا اور چارہ کار ہی نہ رہے۔ اگر ایسا وقت آ گیا تو قوم کے دو حصے ہوں گے۔ ایک محارب حصہ جو براہِ راست جنگ میں شریک ہوگا اور دوسرا شہری طبقہ (CIVIL POPULATION) جو ان کے پیچھے ہوگا۔ جہاں تک محارب حصہ کا تعلق ہے، اس کی بابت صرف حکومت ہی جان سکتی ہے کہ اس کی امکانی وسعتیں کہاں تک ہیں۔ اس باب میں ہمیں حکومت پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اور حکومت کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی فوراً دینی ہوگی۔ اس وقت ہر فردِ مملکت کا مال اور جان اربابِ حکومت کے سپرد ہوگا۔ لیکن جہاں تک شہری طبقہ کا تعلق ہے، ان کے فرائض محارب حصے سے کچھ کم نہیں ہوں گے۔ آجکل کی جنگ کی ٹیکنیک ایسی ہے کہ شکست و فتح کا دارومدار شہری آبادی کی قوتِ حوصلہ اور طاقتِ برداشت پر ہوتا ہے۔ جنگ پھولوں کی سیج نہیں ہوتی اس میں بڑی بڑی مصیبتیں آیا کرتی ہیں۔ اگر شہری آبادی نے ان مصیبتوں کا مقابلہ کر لیا اور اس طرح اپنے نظم و ضبط (MORALE AND DISCIPLINE) کو قائم رکھا تو فتح یقینی ہے۔ (اگر خدانخواستہ) انہوں نے خلفشار مچا دیا اور مشکلات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے، تو پھر محارب حصے کے لئے دوہری مصیبت ہو جائے گی۔ اس لئے قوم کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہے جس میں خالی جذبات سے کہیں زیادہ غور و فکر، تدبر و تعقل اور حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس وقت یہ کاپیاں پریس جا رہی ہیں جس وقت یہ چھپ کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچیں گی نہ معلوم اس وقت صورتِ حالات کیا ہو؟ لیکن جو صورتِ حالات بھی ہو، حق کی حمایت کرنیوالوں کے لئے قرآن کی ہدایات ہر حالت کے لئے موجود ہیں۔ اگر حالت امن ہو تو اپنی حفاظتی تدابیر میں پوری پوری مستعدی اور امکان بھر قوت کا مہیا کرنا۔ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ۔ (۸/۵۹)

جس قدر بھی تم میں قوت ہے اس کے مطابق دشمن کے مقابلے کی تیاری رکھو۔ اپنی سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے تیار رکھو تاکہ اس سے تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمنوں کے دل میں تمہارا رعب قائم رہے۔ ان دشمنوں کے مقابلہ کے لئے بھی جو ابھی تک کر تمہارے سامنے نہیں آئے اس لئے تم انہیں نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں جانتا ہے۔

اور جب مقابلہ آن پڑے تو انفروا خفافا و ثقالا (۹/۴۱) ہلکے اور بھاری میدانِ جنگ میں اتر پڑو اور وہاں فیقتلون و یقتلون۔ یا دشمن کو مغلوب کر لو یا خود جان دیدو۔ ومن یولھم یومئذ دبرہ الا

متحرفا للقتال او متحیزا الی فئۃ فقد باء بغضب من اللہ وماواہ جہنم وبئس المصیر (۸/۱۶) اس دن جو شخص میدان جنگ سے پیٹھ پھیرے بجز اس کے کہ وہ جنگ کے لئے پینترا بدل رہا ہو یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملنے کے لئے لوٹے تو اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بُری جگہ ہے ٹھکانے کی۔

اور اگر دشمن صلح کے لئے جھکے تو تم بھی صلح کے لئے تلواریں نیام میں کر لو۔

(وان جنحوا للسلم فاجنح لہا)۔ یہ تو رہا محارب حصے کے متعلق۔ باقی رہی شہری آبادی۔ سو اس کے متعلق سب سے بڑی تاکید اس امر کی ہے کہ وہ یونہی غلط افواہوں پر کان دھر کر جھگڑا نہ مچا دیں۔

یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (۴۹/۶) اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فتنہ پرداز کسی قسم کی خبر لائے (تو اسے یونہی تسلیم نہ کر لیا کرو) بلکہ اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نادانی میں (اپنے کسی دوسرے) گروہ کو نقصان پہنچا بیٹھو اور بعد میں اپنی حرکت پر پشیمان ہو۔

یہ ہیں جنگ کی صورت میں مختصر ہدایات ان کے لئے جو حق کی حفاظت کے لئے شمشیر بکف اٹھتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ سرزمین پاکستان کی حفاظت کے لئے اٹھنا (کہ جس سرزمین کو قانونِ خداوندی کے نفاذ کا اولین محمل بننا ہے) یکسر حق کی حفاظت کے لئے اٹھنا ہے۔ صرف ایک خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ اس خطۂ زمین کو اس لئے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس میں قرآنی نظام کی تشکیل کی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے اس یقین کے ساتھ اٹھو کہ تم میں سے ہر جان دینے والا مقتول فی سبیل اللہ (شہید) ہے اور ہر زندہ رہنے والا (غازی) اور اس آسمان کے نیچے ان سے بڑھ کر کسی اور کا مقام نہیں۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

یہ تھے ملتِ پاکستان کے "واقعات" اور ہمارے مسائل سنہ ۱۹۵۱ء میں، اس کے بعد آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ہم آج کہاں آ کھڑے ہیں۔

جہانِ نو

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کی تفصیلی فہرست ہے۔

جسے

آپ پوسٹ کارڈ لکھ کر بلا قیمت حاصل فرما سکتے ہیں!

اعلان

ماہنامہ طلوع اسلام ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی خریدار کو پرچہ وقت پر نہ ملے تو اس کی اطلاع ادارہ میں ۱۵ تاریخ سے پہلے پہنچ جانی چاہئیے تاکہ تعمیل کی جا سکے۔ اطلاع ۱۵ تاریخ کے بعد موصول ہونے کی صورت میں پرچہ قیمتاً ارسال ہوگا۔

نوٹ: خط و کتابت میں سالانہ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے!

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت ماہ جون ۱۹۷۶ء) حسبِ ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے ہیں۔

۱۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۲۔ " محمد شریف میر صاحب۔ "	۵/-
۳۔ " عبد الرحمٰن صاحب۔ "	۲/-
۴۔ " سید تصور حسین صاحب۔ خانیوال	۵۰/-
۵۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال (گجرات)	۵/-
۶۔ محترمہ ایس۔ ایس۔ بٹ صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-
(۷) محترم ڈاکٹر دلاور خان صاحب۔ لاہور	۱۰۰/-
۸۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ "	۵/-
۹۔ " محمد شریف میر صاحب۔ "	۵/-
۱۰۔ " محمد ارشاد صاحب۔ گلہڑ گلی۔ مری	۵/-
۱۱۔ " ملک حنیف وحلال صاحب (ستال سیداں) (مری)	۵/-
۱۲۔ " عبد الرحمٰن صاحب۔ لاہور	۲/-
۱۳۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال (گجرات)	۵/-
۱۴۔ " ڈاکٹر محمد شریف صاحب۔ لاہور	۵۰/-
۱۵۔ " ڈاکٹر ظہور احمد صاحب۔ "	۲۰/-
۱۶۔ " ڈاکٹر عبد الواحد صاحب۔ "	۲۰/-
۱۷۔ " محمد رفیق لون صاحب۔ دہران (سعودی عرب)	۱۰۰/-
(۱۸) مسز بشیر ملک صاحبہ۔ ڈھاپ پڑمی (چکوال)	۱۰/-
(۱۹) ضلع لائلپور کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔	۴۰۰/-
۲۰۔ محترم عبد الرحمٰن صاحب۔ لاہور	۲/-
۲۱۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۱۰/-
۲۲۔ " ڈاکٹر اے انصاری۔ ایوب نگر (ڈھاکہ)	۲۵۰/-
۲۳۔ محترم خان محمد حسین صاحب۔ گجرات	۲۰۰/-
۲۴۔ " محمد ارشاد صاحب۔ گلہڑہ گلی (مری)	۵/-
۲۵۔ " عبد السلام صاحب بھینی روڈ۔ لاہور	۱۰/-
۲۶۔ انگلینڈ کی ایک مخیر محترمہ جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں	۱۰۵/-
۲۷۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال (گجرات)	۵/-
۲۸۔ محترمہ مسز شبیر احمد چشتی صاحبہ۔ بہاولپور	۲۰/-
۲۹۔ محترم محمد احسان صاحب۔ بریڈفورڈ (انگلینڈ)	۲۰/-
۳۰۔ " محمد رفیق لون صاحب۔ دہران (سعودی عرب)	۱۰۸/-
۳۱۔ " عبد الرحمٰن صاحب۔ لاہور	۲/-
۳۲۔ پرنسپل یعقوب حسن قریشی صاحب۔ کابل (افغانستان)	۲۰۰/-
۳۳۔ " حبیب اللہ صاحب۔ نیو کراچی	۱۰/-
۳۴۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۳۵۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال گجرات	۵/-
۳۶۔ بزمِ طلوعِ اسلام۔ مردان	۳۵۰/-
۳۷۔ محترم مرزا عبد الغنی صاحب۔ کویت	۵۰/-
۳۸۔ ضلع لائلپور کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔	۴۹۹/-
۳۹۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال گجرات	۵/-
۴۰۔ " علی شبیر چشتی صاحب۔ بہاولپور	۱۵/-
۴۱۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۵/-
۴۲۔ " عبد الرحمٰن صاحب۔ لاہور	۲/-
۴۳۔ " علی محمد صاحب (ریٹائرڈ۔ ڈی ایس۔ پی) جھنگ صدر	۲۰۰/-

نوٹ:- قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۶۵/(۱)/۷۴ مؤرخہ ۹/۴/۷۴ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مورخہ ۲۵/۴/۷۴ کی رُو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ رجسٹرڈ۔ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن

بزمہائے طلوعِ اسلام متوجہ ہوں

سابقہ کنونشن میں طے پایا تھا کہ ۱۹۷۱ء کی سالانہ کنونشن کا انعقاد اکتوبر کے مہینے میں کیا جائے۔ ۲۱۔۲۲۔ اکتوبر کو رمضان المبارک کا آغاز ہوگا۔ اس لئے تجویز یہ ہے کہ کنونشن ۱۵، ۱۶، ۱۷ اکتوبر کو منعقد کر لی جائے۔ بزموں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی آراء سے جلد از جلد ادارہ کو مطلع کریں تاکہ اُن کی روشنی میں تاریخوں کا آخری فیصلہ کر لیا جائے۔

ملک جس بحران سے گزر رہا ہے اور جن نازک حالات کا اسے سامنا ہے ان میں قرآنی راہنمائی کی ضرورت اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ اندریں حالات بزمیں اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس دفعہ کنونشن کس قدر اہم ہوگی لہٰذا ضرورت ہے، کہ بزمیں اس کیلئے (کم از کم ذہنی) تیاری ابھی سے شروع کر دیں اور اپنی تجاویز پر انفرادی طور پر اور بزم کے اجلاس میں غور و خوض کریں تاکہ وہ متفقہ طور پر پاس ہو کر قبل از وقت ادارہ میں پہنچ جائیں۔

آئین سازی کا مرحلہ پھر ملک کے درپیش ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں ذمہ دار گوشوں تک قرآنی راہنمائی پہنچائی جائے۔ اس مقصد کیلئے ادارہ نے ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا ہے چونکہ نیوز پرنٹ پر پابندی ہے اسلئے اسے وہائٹ پرنٹنگ پیپر پر چھپوایا گیا ہے۔ اس سے اس پر لاگت کافی آگئی ہے۔ تبلیغی مقصد کے لئے اسکی اشاعت حسب معمول بلا قیمت ہوگی لیکن جو حضرات اسے خریدنا چاہینگے ان سے اسکی قیمت ایک روپیہ فی پمفلٹ لی جائیگی اور بزموں سے پچاس پیسہ فی پمفلٹ۔ بزموں سے درخواست ہے کہ وہ مطلوبہ تعداد ادارہ سے بہت جلد طلب کر لیں۔ پمفلٹ قلیل تعداد میں چھپوایا گیا ہے۔ بزموں کو ان کی مطلوبہ کاپیاں بذریعہ وی پی بھیجی جائینگی۔

(محمد خلیل) ناظم ادارہ طلوع اسلام۔

آئینِ پاکستان

گزشتہ انتخابات کے بعد جب آئین سازی کے امکانات روشن ہوئے تو ہم نے طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۱ء میں "قرآنی آئین کے بنیادی اصول" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جسے پمفلٹ کی شکل میں بھی چھاپا گیا تھا۔ اس کے بعد، مشرقی پاکستان سے جو طوفان اٹھا تو اس میں خود مملکت کا وجود ہی خطرہ کی زد میں آگیا' اس لئے آئین سازی وغیرہ کے منصوبے غتربود ہو کر رہ گئے۔ اب جو صدرِ مملکت نے اعلان کیا ہے کہ آئین مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی متشکل کی گئی ہے اور جب مسودۂ آئین تیار ہو جائیگا تو اس کے متعلق دانشورانِ قوم سے مشورہ لیا جائیگا' تو ہمیں ہر طرف سے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے ہیں کہ یہ وقت ہے کہ قرآنی آئین کے مذکورہ بالا اصولوں کی ازسرِ نو نشر و اشاعت کی جائے۔ نیوز پرنٹ پر پابندی کی وجہ سے اس پمفلٹ کا جدید ایڈیشن شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اندریں حالات ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مقالہ کی زیادہ طویل تصریحات حذف کر کے' ان اصولوں کو طلوعِ اسلام میں دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ ایک اسلامی مملکت کے آئینی خط و خال پھر سے فضا میں عام ہو جائیں۔ اور جب آئین کا مجوزہ مسودہ سامنے آئے تو اربابِ فکر و نظر دیکھ سکیں کہ اسے کس حد تک اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ ان اصولوں تک پہنچنے سے پہلے دو بنیادی نکات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

دو بنیادی نکات

(۱) قرآنِ کریم انسانی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اصولی راہنمائی دیتا ہے۔ بالعموم انکی جزئیات متعین نہیں کرتا۔ یوں کہیئے کہ وہ ایسی حدود مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے' اسلامی مملکت اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی تفصیلات خود مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول یا حدود غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کی بنیادوں پر مرتب کردہ جزئیات میں' عندالضرورت' ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۲) قرآنِ کریم کاروانِ ملت کے لئے ایک منتہیٰ مقرر کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نصب العین رکھتا ہے جس تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جو قرآنی نصب العین پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتی اور اس تک پہنچنا اپنا مقصودِ حیات سمجھتی تھی۔ ہماری حالت اس سے مختلف ہے۔ ہم نام تو وہی رکھتے ہیں جو اس امت کا تھا لیکن ہمارا ایمان' ان کا سا ایمان نہیں' اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کو خدا کی کتاب مانتے ہوئے بھی ہمارا عمل اس کے مطابق نہیں۔ بنا بریں' ہمارے لئے کشاد کی راہ یہی ہوگی کہ قرآنِ کریم کے مقرر کردہ منتہیٰ کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھیں اور پھر یہ طے کریں کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں' اس سے' اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے کون سی تدریجی منازل اپنے لئے مقرر کریں۔ یوں یہ مملکت

رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، بتدریج اسلامی بنتی جائے گی۔ یہ نہیں کہ اِدھر اُنہوں نے قراردادِ مقاصد پاس کی اور اُدھر ہم نے ڈھول بجانے شروع کر دیئے کہ مملکت اسلامی ہو گئی ہے۔

ان تمہیدی نکات کے بعد اب ان اصولوں کی طرف آیئے جنہیں قرآنِ کریم نے اسلامی مملکت کے آئین کے لئے بطور حدود متعین کیا ہے۔ ہمارا فریضہ ان اصولوں کو سامنے لانا ہے۔ یہ کام مجلس آئین ساز کا ہوگا کہ وہ موجودہ حالات کے مطابق، ان اصولوں کی جزئیات مرتب کرے۔

(١٨)

۱. اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY)

اقتدارِ اعلیٰ سے مراد ہوتی ہے مملکت کی وہ اتھارٹی جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو، اور اس سے سرکشی، مملکت کے خلاف بغاوت قرار پائے۔ ملوکیت میں یہ اتھارٹی بادشاہ کی ذات ہوتی ہے، آمریت میں ڈکٹیٹر اور مغربی انداز جمہوریت میں عوام ـــ قرآن کی رو سے، یہ اتھارٹی نہ بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے، نہ ڈکٹیٹر کو، نہ عوام کو حاصل ہوتی ہے، نہ خواص کو۔ یہ اقتدار صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کا ارشاد ہوتا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ - (۱۲:۴۰) حقِ حکومت، (آخری فیصلہ دینے کا حق) صرف خدا کو حاصل ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸:۲۶) وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ - (۲۱:۲۳) اس کے کسی فیصلہ کو (QUESTION) نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے فلاں قانون ایسا کیوں بنا لیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کی اتھارٹی کو (QUESTION) کیا جا سکتا ہے۔

لیکن خدا تو کسی کے سامنے آتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی بات سن سکتے ہیں، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اس حقِ حکومت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا جواب اس نے خود ہی دے دیا کہ خدا کی حکومت اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعے اختیار کی جاتی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا - (۶:۱۱۴)

(اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم بنا لوں، درآنحالیکہ اس نے تمہاری طرف اپنی کتاب بھیج دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے۔ اور ثانی الذکر میں انسانوں کو ـــ خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو، یا افراد کی جماعت ـــ یہی کفر اور اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ - (۵:۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر ہیں۔

اسی لئے خود حضور نبی اکرمؐ سے جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی تھی، کہا گیا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵:۴۸)

تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔

یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جسے قائداعظمؒ نے ان درخشندہ الفاظ میں پیش کیا تھا جنہیں ہم سو بار دہرا چکے ہیں اور شاید ابھی ہزار بار

اور دہرانا پڑے، تاکہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں قائداعظمؒ کے تصور کے مطابق آئین مرتب کرنا چاہیئے، انہیں معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قائداعظمؒ کا تصور اور ایمان کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی اور نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقے اور مملکت کی ضرورت ہے۔

لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین کی شق اول یہ ہونی چاہیئے کہ

اس مملکت میں اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا جس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ حکومت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی قانون، حکم یا فیصلہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

اسی کو اسلامک آئیڈیالوجی یا نظریۂ پاکستان کہتے ہیں جو اساس ہے ہماری مملکت کی۔

۲۔ مجلس آئین و قوانین ساز کے حدود

قرآن کریم کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس لئے سربراہ مملکت ہو یا پارلیمان، قرآنی احکام و اصولات میں، نہ تو کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمان قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکت کے لئے قانون بنا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی "جمہوریت" لامحدود اور غیر مشروط نہیں ہو سکتی۔ یہ (CONTROLLED DEMOCRACY) ہوگی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہوگا۔

لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین کی دوسری شق یہ ہونی چاہیئے کہ،

مملکت کے قوانین کی اساس قرآن کریم ہوگی اور مجلس قوانین ساز، اسکی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قانون مدون کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکیگا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

ہمارے ہاں اس سے پہلے جو آئین مرتب یا نافذ ہوئے ان میں لکھا جاتا رہا کہ "ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا

ہم نے ہر بار اس کی وضاحت کی۔ چونکہ "سنت" کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو، اسلئے کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکیگا جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ اس پر ہمیں بے حد مطعون کیا گیا لیکن بعد از خرابیٔ بسیار ان حضرات کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رُو سے فی الواقعہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ اندریں حالات اب صواب کی راہ یہی ہے کہ آئین میں یہ شق درج کی جائے کہ ملک کا کوئی قانون قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ہوگا۔

۳۔ فیصلہ کُن ادارہ

اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون قرآنِ مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی رُو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ سفید ہاتھی "محض ورثہ کی ہنڈیاں" ہیں۔ جن سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ ساڑھے آٹھ سال کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ادارے فی الحقیقت بیکار محض ہیں۔ انہیں ختم کر دینا چاہیئے اور ان کی جگہ ایک لاء کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ ملک کے مروجہ قوانین کو قرآن کے مطابق بنانے کی سفارشات کرے اور آئندہ بھی جو قانون زیرِ ترتیب آئے اُسے قرآن کی روشنی میں پرکھ کر اپنی سفارش پیش کرے۔ لیکن اس بات کا آخری فیصلہ عدالتِ عالیہ کرے کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ بنا بریں آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

> اس آئین کے تابع ایک لاء کمیشن مقرر کیا جائے جو ملک کے مروجہ قوانین کا قرآنِ مجید کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ نیز جو قانون آئندہ بھی زیرِ تدوین آئے وہ اسکے متعلق بھی قرآنی روشنی میں اپنی سفارش پیش کرے۔
>
> اس سوال کا فیصلہ کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، مملکت کی عدالتِ عالیہ کرے گی جس میں قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بطور وکیل پیش ہو سکیں گے۔

یاد رکھئے۔ امتِ مسلمہ میں مذہبی پیشوائیت کا تصور اور وجود غیر قرآنی ہے۔ اسلامی مملکت میں یہ فیصلہ کرنا کہ فلاں معاملہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں، حکومت کے قائم کردہ ادارہ کا کام ہے۔

۴۔ معیارِ قومیّت

اس حقیقت کے متعلق اب کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ نسل، رنگ، خون، زبان، وطن کا اشتراک۔ بنا بریں مملکتِ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم پاکستانی قوم کا جزو نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ یہی دو قومی نظریہ کا مفہوم ہے جس پر مطالبہ و تشکیلِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی اور ہے۔

لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین میں اس کی صراحت ہونی چاہیئے کہ

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پاسکتے، اسلئے انہیں امور مملکت میں شریک نہیں کیا جاسکتا، نہ وہ اسکی پارلیمان کے ممبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان ممبروں کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں حتیٰ کہ وہ مملکت کی ان اسامیوں پر بھی تعینات نہیں کئے جاسکتے جن کا تعلق رموزِ مملکت سے ہو۔ انہیں صرف وہ مراعات حاصل ہونگی جن کی تشریح بنیادی حقوق کے ضمن میں کی گئی ہے۔

یاد رکھیئے جس آئین میں یہ شق موجود نہ ہو، نہ وہ آئین اسلامی کہلا سکتا ہے اور نہ ہی وہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے جس میں وہ آئین نافذ ہو۔ قرآن اس باب میں کسی قسم کی مفاہمت کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ دین کے بنیادی اصولوں میں سے ہے ــــ وَ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ۔

———— (۰) ————

۵۔ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

اس حقیقت کے متعلق بھی مزید صراحت کی ضرورت نہیں کہ قرآن کی رُو سے امت میں تفرقہ (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی رُو سے ہو یا سیاسی پارٹیوں کی وجہ سے) شرک اور عذابِ خداوندی کا موجب ہے۔ لہٰذا مملکتِ پاکستان میں اس تفرقہ کا مٹانا ضروری ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کے شرک کو بیک جنبشِ قلم نہیں مٹایا جاسکتا، لیکن سیاسی پارٹیوں کو تو از روئے قانون فوراً ختم کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، اگر

(۱) قرآن کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جائے تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہو سکیگا۔ اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

(۲) تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی ثنویت ختم کر کے سب بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے اُن میں عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی بلند اقدار کا شعور بھی بیدار ہوتا چلا جائے۔ اس طرح اُن کے دل و دماغ سے فرقہ دارانہ امتیازات کی لکیریں خود بخود مٹتی چلی جائیں۔

لہٰذا ہمارے مجوزہ آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

۱۔ قرآن کی اساس پر مملکت کے لئے جو قانون مرتب کیا جائیگا اسکا اطلاق ملک کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں ہوگا اور اس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہوگی۔

۲۔ سیاسی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔

———— (۰) ————

۶۔ بین الملّی تعلّقات

دین کے اشتراک پر قومیت کی تشکیل کے یہ معنی نہیں کہ کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے الگ، ایک جداگانہ قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ (اور قرآن کا درحقیقت منشاء بھی یہی تھا) کہ دین کے رشتہ میں منسلک افراد کو خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی بستے ہوں، ایک قوم کے افراد قرار پائینگے۔ امتِ واحدہ دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے کرۂ ارض میں مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کی الگ الگ حکومتیں ہو سکتی ہیں لیکن وہ الگ الگ اقوام میں نہیں بٹ سکتے۔ لہٰذا قرآنی نقطۂ نگاہ سے جہاں پوری مملکت کی سالمیت اور وحدت اسلام کا بنیادی تقاضا ہے، اسکے ساتھ ہی دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں سے اس قسم کے تعلقات جیسے ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں، دین کی لازمی شرط ہے۔ بنا بریں، قرآنی دستور پاکستان کی ایک شق یہ بھی ہونی چاہیئے کہ:۔

> دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کو اس وحدت کیطرف دعوت دی جائے اور عملاً انہیں اس رشتے میں پرونے کی کوشش کی جائے۔

(۷)

۷۔ نظامِ حکومت

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے، ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن ہم نے پاکستان میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے جس کی وجہ سے خود پاکستان میں بسنے والے مسلمان بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے پہلے ملک کو دو بازوؤں میں تقسیم کیا اور اب مغربی بازو کو چار ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ یہ تقسیم اگر محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن ہم نے ان خطوں میں الگ الگ مفادات کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن سے یہ قوم مختلف اقوام میں تقسیم ہو گئی، اور وہ بھی ایسی اقوام جن میں باہمی رقابت، عصبیت اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جائیں۔ ہم نے ان خطوں میں بسنے والوں کے لئے ملازمتوں میں جداگانہ تناسب مقرر کیا اور پارلیمان میں نشستوں کی تقسیم بھی اسی نسبت سے کر دی۔ یہ تقسیم، باہمی مفادات میں ایسے مستقل تصادم کا موجب بن گئی جس سے نہ صرف ناخن، گوشت سے الگ ہو گیا بلکہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا۔ یہ نفرت اور مغائرت جن خطرات کا موجب بن سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ ان خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے نظامِ حکومت میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ پورے پاکستان میں وحدانی انداز (UNITARY - FORM) کی حکومت قائم کی جائے۔ جس میں مختلف علاقوں کی آبادی کی کوئی تخصیص نہ ہو اور انتظامی مقاصد کے لئے ملک کو ضلعوں اور کمشنریوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نہ کوئی صوبہ الگ ہو اور نہ اس کی پارلیمان جداگانہ۔ ملازمتوں کی اسامیاں جوہرِ ذاتی کے معیار پر پُر کی جائیں اور تعلیم کا ایسا انتظام

کیا جائے جس سے بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، افغانی کے امتیازات مٹ کر قوم امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائے۔ اس کے سوا ہمارے پنپنے کی صورت کوئی نہیں۔ آئینِ پاکستان میں اسی اصول کے مطابق حکومت کی تفاصیل مرتب ہونی چاہئیں۔

۸۔ تشکیلِ حکومت

قرآنِ کریم، حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) سے بحث نہیں کرتا۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صدارتی نظام قرآنی تصورِ مملکت کے زیادہ قریب ہے۔ اس میں امورِ مملکت سے متعلق فیصلوں کی ذمہ داری ایک فرد پر مرکوز ہو جاتی ہے جس سے باز پرس اور مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔ پارلیمانی نظامِ جمہوریت میں کوئی فرد کسی فیصلہ کا ذمہ دار، لہٰذا مسئول قرار ہی نہیں پاتا۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں سربراہِ مملکت ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اسلام میں آمریت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جب سربراہِ مملکت ان حدود میں گھر جاتا ہے جو قرآن نے متعین کی ہیں تو اس کی آمریت ختم ہو جاتی ہے۔

اسلامی مملکت کی پارلیمان میں حزبِ اختلاف کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو پارلیمان کے ممبر ہی نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہو جانا جن میں سے ایک پارٹی کا منصب ہی دوسری پارٹی سے برسرِ پیکار رہنا ہو، اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے پارٹیاں دنیا میں دو ہی ہیں۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان — یعنی ایک محمدؐ کی مجلسِ مشاورت اور دوسرا ابوجہل اور ابولہب کا ندوہ۔ حضورؐ کی مجلسِ مشاورت کا، مخالف اور موافق گروہوں میں بٹے رہنا، قرآنی تصورِ امت کی نقیض تھا۔ باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے۔ لیکن امت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا یکسر غیر اسلامی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حزبِ مخالف کے بغیر جمہوری نظام قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جہنم میں جائے وہ نظام جس کا لازمی نتیجہ امت کا متخالف اور متحارب گروہوں میں بٹے رہنا ہو۔

قوم میں بہرحال عام علمی اور ذہنی سطح کے افراد بھی ہوں گے اور خاص صلاحیتوں کے مالک افراد بھی۔ مجلسِ مشاورت میں ان دونوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارلیمان کا دو ایوانوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:-

> پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک ایوانِ عام ابنائے ملت پر مشتمل اور دوسرا خاص صلاحیتوں کے اہلِ اعیانِ امت پر۔ ایوانِ عام کے اراکین کیلئے بھی کم از کم تعلیم کی شرط ضروری ہے۔ (آئین میں اس کی تصریح ہونی چاہیئے)
>
> ۲۔ پارلیمان کے ایوانوں میں پارٹیوں کا وجود قانوناً ممنوع ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت سے طے ہونگے اور حزبِ موافق اور حزبِ مخالف کا غیر اسلامی تصور کارفرما نہیں ہوگا۔

۸-(الف) اُصولِ اہلیّت

ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ..... (۴/۵۸) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطور امانت دیئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اس "اہلیت" میں علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے۔ کیونکہ قرآن کی رُو سے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ لہٰذا مملکت کے اقترانِ ماتحت سے لے کر صدارتِ عظمیٰ تک، اہلیت اور پاکیزگیٔ سیرت کی شرائط ہر ایک پر عاید ہوں گی اور معاشرہ میں مدارجِ جوہر ذاتی اور حسنِ کردار کی رُو سے متعین کئے جائینگے۔ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (۴۶/۱۹) ارشادِ خداوندی ہے۔ لہٰذا آئینِ مملکت کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ

صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ)، ارکانِ مجالسِ مقننہ (پارلیمان) اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت اور ان دیگر افراد پر جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں حسب ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

۱۔ قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

۲۔ متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی کماحقہٗ اہلیت۔

۳۔ سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

۴۔ ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اسکا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا اسی طریق سے اسے معطل یا برطرف کیا جاسکتا ہے۔

(۰)

۸-(ب) نظامِ تعلیم

قوم کا مدار، بڑھنے، پھولنے پھلنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے اور یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی رُو سے، بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے والدین کے سر پر نہیں ہوگی بلکہ یہ حکومت کی اجتماعی ذمہ داری ہوگی۔ وہ مختلف مدارج پر بچوں کو چھلنے میں چھانتی چلی جائیگی اور ہر بچے کی مزید تعلیم کا انتظام اس کی ذہنی افتاد اور طبعی رجحان کے مطابق کرتی جائیگی۔

نظامِ تعلیم میں مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی تفریق ختم کر دی جائیگی جس کی رُو سے الگ مذہبی درسگاہوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طالب علموں کو علومِ عصرِ حاضر کی تعلیم اس انداز سے دی جائے گی کہ وہ جو مضمون بھی پڑھیں، اس میں

دیکھ سکیں کہ قرآن مجید اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ ان کی تعلیم

از کلیسیا دیں در دنیا گستاد

کی عملی مثال پیش کرے۔ اس کیلئے ظاہر ہے کہ عربی زبان کی تعلیم لازمی ہوگی۔ بنا بریں قرآنی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

قوم کے بچوں کی (اول سے آخر تک) تعلیم کی ذمہ داری انفرادی طور پر والدین کی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہوگی۔ نظامِ تعلیم میں مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائیگا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دیجائیگی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

———— (۸) ————

۹۔ عدلیہ

اسلامی مملکت کا پورا نظامِ عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل میں عمرانی عدل بھی شامل ہے اور قانونی عدل بھی۔ جہاں تک عدلِ عمرانی کا تعلق ہے، قرآن کے اصولات یہ ہیں کہ

(۱) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔

(۲) ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

(۳) معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رُو سے متعین کی جائے۔ (۴) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کیمطابق ذمہ داری سونپی جائے۔ (۵) بنیادی حقوقِ انسانیت کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔

جہاں تک قانونی عدل کا تعلق ہے، عدل کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ قانون کی رُو سے کیا جائے۔ یہ درست ہے۔ لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خود قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا اور اس کے نزدیک قانون کے مبنی بر عدل ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدود کے مطابق ہو۔ اس لئے اس نے عدل کی شرط یہ قرار دی ہے کہ یَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱) الحق کے مطابق عدل کیا جائے اور الحق سے مراد وحی خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ مملکت کی عدالتِ عالیہ اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ مملکت میں نافذ ہونیوالا قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔

عدل کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا حصول بلاقیمت ہو۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے اور حقدار کو اس کا حق دلا دے۔ ایسا کرنے میں مظلوم سے معاوضہ کس بات کا؟ یہ تو مملکت کا بنیادی فریضہ ہے اور فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ کیسا؟

اسلامی مملکت میں عدل کا تقاضا ایک اور بھی ہے۔ حکومت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جان، مال، عصمت، عزت، آبرو کی حفاظت کریگی۔ اگر کسی شخص کا (اس کی اپنی غلطی یا غفلت کے بغیر) اس باب میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ

(۱) اس شخص کے نقصان کی امکانی تلافی کرے۔ اور

(۲) مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے تاکہ معاشرہ میں جرائم کی روک تھام ہو جائے۔

قرآنی عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے، اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی وہ معاشرہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھا جائے۔ تفتیش کے سلسلہ میں ملزم کے خلاف پولیس کا تشدد، یا عدالتی فیصلہ تک ملزم کو حبسِ بے جا میں محبوس رکھنا عدل کے منافی ہے ۔ اور بغیر مقدمہ چلائے کسی کو سزا دے دینا سراسر ظلم۔

قرآنِ کریم نے اسلامی معاشرہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ خوف خطرہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ مملکت اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ و مامون محسوس کریں اور امن پسند شہریوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ عدل کا بنیادی تقاضا ہوگا۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین میں یہ شق بھی ہونی چاہیئے کہ

> معاشرتی اور قانونی عدل مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے۔ ان کے عدمِ حصول کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے گا۔
>
> قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ معاملہ کا فیصلہ قانون کی رو سے ہوگا، اور اس کیلئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائیگا، نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائیگا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

(۰)

۱۰۔ افراد اور مملکت کا تعلق

افراد اور مملکت کے تعلق کو قرآنِ کریم نے ایک آیت میں ایسی جامعیت سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں فکر و بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱)

یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کے نفوس اور اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

یعنی خدا اور بندۂ مومن کے مابین بیع و شریٰ کا ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے بندۂ مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ بیع و شریٰ کا یہ معاملہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں ۔ خدا کی طرف سے یہ معاملہ، وہ حکومت طے کرتی ہے جو دنیا میں خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے (اور جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے) افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال حکومتِ خداوندی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور حکومت اس کا انتظام کرتی ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی میسر ہو اور آخرت میں بھی۔ "جنت کی زندگی" کی تفاصیل طول طویل ہیں لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ اس میں انسان کو ہر قسم کی خوشگواریاں اور فراوانیاں اور اس کے ساتھ قلبی اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے (اخروی دنیا کی جنت اس پر مستزاد ہے)۔

یاد رہے کہ فسطائی نظام میں جو مملکت (STATE) کو معبود قرار دے کر افرادِ معاشرہ کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے قرآن کے معاملۂ بیع و شری میں یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اس میں افراد کو جو جنت کی زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے تو اس زندگی میں افراد نہ کسی انسان کے محتاج ہوتے ہیں نہ محکوم۔ اس میں محکومی صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے اور نظامِ مملکت ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ــــ لہٰذا اس نظام میں فسطائی نظام کا استبداد نہیں ہوتا جس میں افراد کی ہر قسم کی آزادی اسٹیٹ کی کالی ماتا کے استھان پر قربان کر دی جاتی ہے۔ لہٰذا اسلامی آئین میں ایک شق یہ بھی ہوگی۔ کہ

> مملکت میں کوئی فرد نہ کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔ اس میں محکومیت صرف قانون کی ہوگی جس سے کوئی شخص بھی بالا نہیں ہوگا۔ مملکت عدل و احسان کی عام کارفرمائی سے ملک میں ایسی فضا پیدا کریگی جس سے قانون کا احترام افرادِ مملکت کے دل کی گہرائیوں کا تقاضا بن جائے اور اس طرح ہر شخص بلاخوف و حزن زندگی بسر کرے۔

(۰)

۱۱۔ معاشی نظام

قرآن کریم نے کہا ہے کہ مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں جن ذمہ داریوں کو خدا نے اپنے اوپر لیا ہے، یہ مملکت انہیں پورا کرے۔ ان ذمہ داریوں میں ایک بنیادی ذمہ داری نوعِ انسان کو رزق (سامانِ زیست) بہم پہنچانا ہے۔ اس باب میں خدا کا ارشاد ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

لہٰذا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائلِ پیداوار اس کی اپنی تحویل میں نہ ہوں۔ اگر وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں تو مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟

وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے اور زمین کو خدا نے اَرْضُ اللّٰهِ (۴/۹۷) "خدا کی زمین" قرار دیا ہے۔ اسے نوعِ انسان کے لئے روزی کا سامان بتایا ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۷/۱۰)، اس میں جو کچھ ہے، رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ہے یعنی بندوں کے لئے رزق (۵۰/۱۱)، لہٰذا اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) رہنا چاہیئے یعنی تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶/۷۳) یعنی تمام بھوکوں کے لئے سامانِ رزق ہونا چاہیئے۔

زمین سے ایک تو سامانِ خوراک برآمد ہوتا ہے اور دوسرے وہ تمام خام مسالہ (RAW MATERIAL) معدنیات وغیرہ جن سے مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ لہٰذا مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ (۲/۲۶۷) میں زراعت اور صنعت و حرفت دونوں آجاتی ہیں۔

اب رہی انسانوں کی کمائی، تو اسے قرآن نے اموال الناس یا اموالکم کہہ کر بچا رکھا ہے یعنی لوگوں کا مال یا تمہارا مال۔ لیکن

اس مال پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ایک شخص مومن کہلاتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس معاہدہ پر دستخط کر دیتا ہے جس کی رُو سے وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ لہٰذا مومن کا مال بھی اس کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتا۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق کہا کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال میں سے کس قدر افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشو و نما پہنچانے کے لئے دے دیں۔ کہا کہ ان سے کہہ دو۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ اس نظام کی رُو سے آپ دیکھئے کہ

(۱) نہ تو زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں رہتی ہے۔ اور

(۲) نہ ہی فالتو روپیہ (SURPLUS MONEY) کسی کے قبضے میں رہتا ہے۔ لہٰذا اس میں جائیدادیں بنانے کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ اور چونکہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اس لئے اس نظام میں ملازمین کی تنخواہیں یا مزدوروں کی اجرت (WAGES) مقرر کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ

ہر فرد، اپنی اپنی استعداد کے مطابق وہ کام کرے جسے اس کی اہلیت و صلاحیت کے پیشِ نظر اس کے سپرد کیا گیا ہو اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے وسائلِ پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے۔

یہ ہے قرآن کے معاشی پروگرام کا منتہیٰ۔ اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے اپنے آئین میں بطور مقصدِ اعلیٰ (ULTIMATE GOAL) درج کرے اور اس کے بعد ایک عملی پروگرام مرتب کرے جس کی رُو سے آہستہ آہستہ بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچا جا سکے۔

(۵)

۱۲۔ غیر مسلموں کی پوزیشن

اس آئین کی شق نمبر ۷ میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کے افراد نہیں تسلیم کئے جا سکتے۔ اس لئے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے سے باہر کے انسانوں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے۔ یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور و فکر کریں، اور اس کے بعد اگر علیٰ وجہ البصیرت اور بطیبِ خاطر (یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس نظریہ کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت استوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس نظریہ کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی قسم کے نقصان میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، عبادتگاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں

شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسن سلوک کیا جائے گا (۴/۶۰) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (۵/۸) حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ مسلمانوں سے بھی زیادہ فائدہ میں رہیں گے کہ مدافعت کے سنگین مسلمانوں کے سپرد ہونگے اور اسکے دوران میں یہ غیر مسلم بھی حصہ دار ہونگے۔ دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمان فوجیں اپنے سینوں پر گولیاں کھا کر غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرینگی۔ (۲۲/۴۰)

ان تمام مراعات کے باوجود اگر یہ غیر مسلم ترک وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی (۵/۳۳-۳۴) بغاوت کی سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے — لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ:-

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جاسکیں گے۔ کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہونگے۔ ان کی جان، مال، آبرو، پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی، مذہبی آزادی ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کیا جائیگا۔

اسکے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کیطرف مستقل طور پر منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنے ہاں بسانے پر آمادہ ہو تو اسلامی مملکت انہیں اُس مملکت کیساتھ معاہدہ کرکے انکے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام کریگی۔

لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین و قوانین سے سرکشی برتیں گے، تو انہیں اس بغاوت کی سزا دیجائے گی۔

—— (۰) ——

۱۳۔ نظریۂ پاکستان

مملکتِ پاکستان کا سنگِ بنیاد نظریۂ پاکستان ہے۔ لیکن آج تک مستند طور پر یہ متعین نہیں کیا گیا کہ اس نظریہ کا مفہوم کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آئین میں اس کا مفہوم واضح کیا جائے اور یہ شق درج کی جائے کہ اس نظریہ کے خلاف کچھ کہنا یا کرنا سنگین جرم متصور ہوگا جس کی سخت سزا دی جائے گی۔

—— (۰) ——

۱۴۔ بنیادی حقوق

اصولاً ہر حق کسی نہ کسی ذمہ داری کے پورا کرنے کے نتیجہ میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً مومن اور خدا کے مابین جس معاہدہ کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے (یعنی مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے)، تو مومن جنت کا

حقدار اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔ لیکن اس اصول میں بعض مستثنیات بھی ہیں جن میں حق، بغیر ذمہ داری کے واجب ہوجاتا ہے۔ مثلاً جو شخص کام کرنے کے قابل نہ رہے، وہ مملکت سے سامانِ زندگی بطورِ حق طلب کرسکتا ہے۔ نیز بعض حقوق خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً جان کی حفاظت ہر فردِ معاشرہ کا حق ہے۔ لیکن جرمِ قتل کی سزا میں اسے اس حق سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں حقوق کی کوئی الگ فہرست نہیں دی گئی۔ اس نے مستقل اقدار کا ذکر کیا ہے جن کا تحفظ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ انہی اقدار (یا مملکت کی ذمہ داریوں) سے حقوق مستنبط کئے جاسکتے ہیں مثلاً۔

۱۔ احترامِ آدمیت

ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ افرادِ مملکت کی قیمت متعین کرنے (یعنی معاشرہ میں ان کا مقام مقرر کرنے) میں ان کی پیدائش (حسب نسب) کے اعتبار سے کوئی تفریق و تخصیص نہیں کی جائے گی۔

۲۔ جنسی مساوات

قرآن کی رُو سے جنسی تفریق نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں محض عورت ہونے کی حیثیت سے مردوں سے کمتر۔ فطری وظائف کے اعتبار سے ان کے فرائضِ زندگی میں فرق ضرور ہے لیکن جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رہیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔

۳۔ مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی۔

معاشرہ میں ہر فرد کا مقام اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی بنا پر متعین کیا جائے گا۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) قرآن کی مستقل قدر ہے۔ یعنی ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق۔ اسلامی مملکت میں تعینِ مدارج کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہوسکتا۔

۴۔ حقِ آزادی۔

قرآن کی رُو سے آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔ (۳/۷۹) لا الٰہ الا اللہ اس آزادی کا منشور ہے۔

۵۔ عدل و احسان۔

عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا حق مل جانا اور احسان کے معنی ہیں جس شخص میں کوئی کمی رہ جائے اس کمی کا پورا کر دینا۔ عدل اور احسان، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے (۱۶/۹۰) اور افرادِ مملکت کا حق۔

۶۔ رزق (سامانِ زیست) کا حق

ہم دیکھ چکے ہیں کہ افرادِ معاشرہ کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے، لہٰذا افرادِ معاشرہ کا حق۔ لیکن یہ حق مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ کام کرنے کے قابل ہر فرد اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق وہ کام سرانجام دے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

سامانِ زیست میں وہ اسباب و ذرائع بھی شامل ہیں جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً

تعلیم و تربیت۔ اسے ہر انسانی بچہ بطور استحقاق طلب کر سکتا ہے۔

۷۔ جان کی حفاظت

افرادِ معاشرہ کی جان کی حفاظت، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ لیکن جب مجرم کی پاداش میں سزائے موت دی جائے تو مجرم کا یہ حق سلب ہو جاتا ہے۔

اور عند الضرورت اپنی جانوں کو خود پیش کر دینا مومنین کے اس معاہدہ کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

۸۔ مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہے جو مملکت کی اجازت سے افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ جو چیز مملکت کی طرف سے کسی ایک فرد کے تصرف میں رہنے کے لئے دی گئی ہے اُسے دوسرا فرد زبردستی اپنے قبضہ میں لے لے۔ (۴/۲۹)

۹۔ سکونت کی حفاظت

ضروریاتِ زندگی میں جن کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے، رہائش کا انتظام (مکان) خود بخود آجاتا ہے، اسلئے کسی کو سکونت سے محروم کر دینا اس کے اس حق کو سلب کر لینا ہے۔ (۲۴/۲۷)

۱۰۔ عصمت کی حفاظت

عصمت، انسان کا شرف ہے، یہ وہ خصوصیت ہے جس کا حیوانات میں احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا، قرآن کریم اس کی حفاظت کو بنیادی اور غیر مشروط حق قرار دیتا ہے۔ (۲۴/۳۰؛ ۲۴/۳۱)

۱۱۔ شادی میں انتخاب کا حق

مرد اور عورت کے مابین، قوانینِ خداوندی کے مطابق، ازدواجی زندگی بسر کرنے کے معاہدہ کا نام نکاح ہے اور ظاہر ہے کہ معاہدہ کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن تاکید کرتا ہے کہ یہ معاہدہ فریقین کی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے ۴/۱۹) اور ظاہر ہے کہ جس طرح اس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین کو برابر کا حق حاصل ہے، اسی طرح عند الضرورت اسے فسخ کرنے کا حق بھی فریقین کو یکساں طور پر حاصل ہوگا۔

۱۲۔ حسنِ ذوق کا حق

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے اسکے اس حق سے محروم کر دے (۷/۳۲) حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سامانِ زیبائش و آرائش سے متمتع ہونا ہر فرد کا حق ہے۔

۱۳۔ مذہبی آزادی کا حق۔

مذہب کے معاملہ میں قرآن ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے کسی بات کو عقل و فکر کی رُو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) اس کا بنیادی اصول ہے اور ہر فرد کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ کفر اور ایمان میں سے جونسا راستہ جی میں آئے اختیار کرے۔ (۱۸/۲۹) لہٰذا مذہب کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسلام، ایک مذہب نہیں بلکہ دین (نظامِ زندگی) ہے جس کے مطابق اسلامی مملکت قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اس

کی تو اجازت دیتا ہے کہ جس کا جی چاہے اس جماعت (امتِ مسلمہ) میں شامل ہو جائے جو اس مملکت کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جس کا جی چاہے اس میں شامل نہ ہو (غیر مسلم رہے) لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس حدود مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کر لیں۔ یہ تو ریاست درونِ ریاست (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مترادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ نہ ہی اس کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ جس کا جی چاہے اس مملکت کے قوانین کی پابندی کرے اور جس کا جی چاہے ان سے انحراف کرے۔ قوانینِ مملکت سے انحراف جرم ہوتا ہے اور ان سے سرکشی بغاوت۔ غیر مسلموں کو ان کے شخصی معاملات میں اپنے مذہب کی پیروی کی اجازت ہوگی، قوانینِ مملکت کے سلسلہ میں نہیں۔

۱۴۔ مظلوم کو فریاد کا حق

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہر مظلوم کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ظلم کی فریاد کرے۔ (۴/۱۴۸) اس کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ اس کا بھی حق دیتا ہے (حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے کہ) ہر شخص حق اور انصاف کی شہادت دے، خواہ وہ کسی کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ (۴/۱۳۵)

۱۵۔ ملزم کا حقِ حفاظت

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہو جائے، اسے بے گناہ سمجھا جائے۔ نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی اسے معاشرہ میں حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ سزا جرم کی ہوگی۔ الزام کی نہیں۔ (۴۹/۱۲ ; ۲۴/۱۶)

۱۶۔ امن و اطمینان کی ضمانت

اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ نہ ہی انہیں خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) کی فضا پیدا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

۱۷۔ اپنی اپنی ذمہ داری

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اسلامی مملکت کا بنیادی شعار اور افرادِ مملکت کا بنیادی حق ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا فریضہ سرانجام دینے کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکیگا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ حقوق جو (مشروطہ اور غیر مشروطہ طور پر) اسلامی مملکت کے افراد کو حاصل ہوں گے۔ ان کی ضمانت آئین کی رو سے دی جانی ضروری ہے۔

حرفِ آخر

یہ ہیں ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس آئین کے بنیادی اصول جنہیں قرآنِ کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔ اس آئین کے علاوہ کوئی اور آئین، میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا اس لئے کہ یہ آئین ان اصولوں پر مبنی ہے جن کے مطابق کائنات کا یہ کارگہ عظیم اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے۔ قرآن میں ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَ لَهٗ

اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا - (۳/۸۳) کائنات کی پہتیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے" انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو خدا کے قوانین کو بطور ضابطۂ زندگی اختیار کرلے اور چاہے تو اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لیکن اسے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۵)

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا وہ دین (آئین) میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرالامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا ضابطۂ حیات، قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصوّر یا قانون بار پا سکتا ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہو۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۶/۱۱۴)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ سو تو اس باب میں جھگڑا کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اس آئین کے اصول ہر طرح سے مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں ہو سکتا۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)

اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئین خدا کی طرف سے عطا کردہ ابدی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ انسانوں نے جو آئین و ضوابط بھی مرتب کئے ہیں وہ حقیقت کے متعلق ظن و قیاس پر مبنی ہیں خواہ ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ملتِ اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدین کے سوا کسی اور آئین کا اتباع نہیں کر سکتی۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۶/۱۱۶)

اگر تو ان لوگوں کی بات ماننا جائے جو دنیا میں اکثریت سے ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راستے گمراہ کر دیں گے (وہ خود) ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں (اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں)

اس لئے آئینِ خداوندی کو چھوڑ کر، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط کا اتباع کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اقوام کے

تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کے ہاں کی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جا سکتی جو قرآن کے آئین اور نظام کے خلاف ہو۔ اسلامی آئین کی اصل و بنیاد صرف خدا کی کتاب ہے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (۱۱/۱۴)

پھر اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ آئین عطا کرتا ہے۔ اس لئے اس کی رُو سے اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ آپ کچھ اصول قرآن کے اختیار کر لیں اور کچھ خارج از قرآن، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط سے مستعار لے کر۔ ایسا کرنا شرک ہو گا۔ قرآنی آئین کو پورے کا پورا اختیار کرنا ہو گا۔ فَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (۲/۲۰۸) اس کا واضح ارشاد ہے "کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور دوسرے حصے سے انکار کر دینا" ایسا جرم ہے جس کی سزا، اس دنیا کی ذلت و خواری اور آخرت کے عذاب شدید کی شکل میں ملتی ہے۔ (۲/۸۵)۔ لہذا، یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی آئین کو بطور نصب العین سامنے رکھ کر، اس تک بتدریج پہنچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی مملکت کے آئین میں کوئی ایسی شق رکھ لی جائے جو قرآنی اصولوں سے متصادم ہو۔ اس قسم کی ایک شق بھی سارے کے سارے آئین کو غیر اسلامی بنا دے گی۔

اور اسلامی مملکت کا نظام، اپنے تدریجی مراحل میں ہو یا انتہائی منزل میں، صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکے گا جن کی سیرت خود قرآنی قالب میں ڈھلی ہو۔ بات خالی آئین اور قانون سازی کی نہیں، سیرت سازی کی بھی ہے۔

——— (※) ———

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور
ہر اتوار ——— ۸ بجے صبح
بمقام: ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور

ملتان
بروز جمعہ ——— (بذریعہ ٹیپ) ——— بعد نماز مغرب
بمقام: شاہ محمد اینڈ سنز ۔ بیرون پاک گیٹ

کراچی
ہر اتوار ——— ۹½ بجے صبح ——— بذریعہ ٹیپ
بمقام: دفتر بزم طلوع اسلام
۱۱/۳ فردوس مارکیٹ (بالمقابل بس سٹاپ) محلی چورنگی ۔ ناظم آباد ۔ کراچی ۱۸

دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

المیۂ مشرقی پاکستان کی داستانِ خونچکاں

ہم نے طلوعِ اسلام کی سالانہ اشاعت (بابت جولائی ۱۹۷۱ء) میں المیۂ مشرقی پاکستان کی تفاصیل پیش کی تھیں ـــــ کچھ اپنوں کی اور کچھ غیروں کی زبانی ـــــ صدرِ پاکستان نے اپنی ۲۸ جون کی نشری تقریر میں ان واقعات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس المیہ کا یہ حصہ بھی طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ ہو جائے، بالخصوص اس لئے کہ صدرِ پاکستان کے بیان سے زیادہ مستند اور مصدقہ شہادت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے تمہیدی واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

"جیسا کہ میں اپنی ۲۶ مارچ کی تقریر میں بتا چکا ہوں، ۱۵ مارچ سے میں جب تک ڈھاکہ میں رہا میں نے شیخ مجیب اور ان کے اصلاح کار ٹیم سے کئی ملاقاتیں کیں۔ ایک طرف تو وہ ہم سے بات چیت کر رہے تھے اور دوسری طرف وہ اور ان کے پیروکار دھاندلی کے ذریعہ قطعی طور پر الگ ہونے کے لئے خفیہ تیاری کر رہے تھے۔ اس بات چیت کے آخری مرحلے میں یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے اصلاح کار ایک پاکستان کی بنیاد پر کوئی سمجھوتہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی طرح مجھ سے اس قسم کا کوئی اعلان کروا لیں جس کے ذریعہ قومی اسمبلی عملاً دو آئین ساز اسمبلیوں میں تقسیم ہو جائے اور اس طرح فیڈریشن کی بجائے کنفیڈریشن بن جائے اور مارشل لاء کی حاکمیت کے ختم ہو جانے سے ملک میں پوری انتری پھیل جائے۔ انہیں توقع تھی کہ اس منصوبے کے ذریعہ وہ بنگلہ دیش کی ایک علیحدہ مملکت بنا لیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح جو پاکستان بابائے ملت نے بنایا تھا وہ ختم ہو جاتا۔

کالعدم عوامی لیگ کے علیحدگی پسند اور بے ضمیر عناصر نے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ اس طرح ہمارے عزیز وطن کے تمام ٹکڑے ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا جو برصغیر کے مسلمانوں کی امنگوں اور تمناؤں کا آئینہ دار اور ان کی مساعی اور انتھک کوششوں کا ثمر ہے۔ شیخ مجیب اور ان کے ٹولے کی تشدد پر مبنی عدم تعاون کی تحریک نے جو تین ہفتے جاری رہی ہر طرف لوٹ مار، آتش زنی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں نے صوبائی خود مختاری کے حق میں ووٹ دیئے تھے نہ کہ ملک کے حصے بخرے کرنے کے لئے۔ کالعدم عوامی لیگ کے چند سرکردہ عناصر نے ملک کے مفاد کو ذاتی سیاسی اور آئینی مسائل کو قومی سالمیت کی خاطر باہمی رواداری اور بات چیت سے سلجھانے کی بجائے سرکشی، توڑ پھوڑ اور علیحدگی کی راہ اختیار کی۔ اس طرح کالعدم عوامی لیگ کے مٹھی بھر رہنماؤں نے میرے وہ تمام

کوششیں ناکام بنا دیں جو میں نے سیاسی جماعتوں کو ایک پائیدار اور قابلِ قبول آئینی ڈھانچے پر متفق کرنے کے لئے کی تھیں۔ ایک طرف تو انہوں نے اپنی مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کے ذریعے بات چیت میں رکاوٹ پیدا کر دی اور دوسری طرف حکومت سے کھلی بغاوت کی۔

ملک کی بہادر افواج جنہوں نے ہر محاذ پر جاں نثاری کے ساتھ قوم کی خدمت کی ہے شرپسندوں کی کارروائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے مصمم ارادے کے ساتھ میدان میں نکل آئیں۔ یہ ایک کٹھن کام تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہمسائے ملک نے ہمیں کمزور اور مفلوج کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس صورتِ حال کو مزید بگاڑنے کے لئے وہ فوراً آدمیوں اور ساز و سامان سے علیحدگی پسندوں کی مدد کو اتر آیا۔

یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا گیا۔ جیسے جیسے ہماری افواج آگے بڑھتی اور پھیلتی گئیں ویسے ویسے عدم عوامی لیگ کے انتہا پسندوں، باغیوں اور ہمارے دشمن ہمسایہ کے درمیان گٹھ جوڑ کا بھیانک منصوبہ سامنے آتا گیا اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ علیحدگی پسندوں اور شرانگیزوں، باغیوں اور سرحد پار کے دخل اندازوں نے عرصہ تک آپس میں مل بیٹھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ اس مہم کی ایک ایک تفصیل طے کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی سالمیت تباہ ہو جائے اور مشرقی بازو کو باقی ملک سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ ایک طرف تو شرانگیز عناصر باغی اور مداخلت کار مل کر پاکستان کی مسلح افواج کی مزاحمت کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان کے ریڈیو اور اخبارات نے پاکستان کے خلاف جھوٹ کے انبار لگا دیئے اور مشرقی پاکستان کے واقعات کے متعلق دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔

سفارتی محاذ پر بدنام کرنے سے لے کر مسلح مداخلت اور حملہ کی کھلی دھمکیوں تک کوئی ایسا حربہ نہیں تھا جو ہندوستان نے پاکستان کو مرعوب کرنے کے لئے استعمال نہ کیا ہو۔ ہندوستان کی طرف سے ہمارے اندرونی معاملات میں یہ کھلی مداخلت بھیانک نتائج پیدا کر سکتی تھی لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہماری مسلح افواج نے تمام وطن دشمن عناصر کا صفایا کر کے جلد ہی صورتِ حال پر قابو پا لیا۔ آج قوم کو بجا طور پر اپنی مسلح افواج پر فخر ہے اور اس کارنامہ پر ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آیئے ہم اس موقع پر خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اس کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہمارے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچا لیا۔"

(بحوالہ مساوات، بابت ۲۹ جون ۱۹۷۱ء)

صدر پاکستان نے اس سے پہلے (اپنی پریس کانفرنس منعقدہ ۲۶ مئی میں) اس امر کا بھی انکشاف فرمایا تھا کہ

"یہ امر اب پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ کالعدم عوامی لیگ اور اسکے مؤیدین کی اسکیم یہ تھی کہ چٹاگانگ کی بندرگاہ اور ڈھاکہ کے ہوائی اڈہ پر قبضہ کر کے مجھے اور میرے رفقاء کو گرفتار کر لیا جائے۔

اور یہ بھی کہ

چوبیس دن تک مجیب الرحمٰن نے (مشرقی پاکستان میں) ایک متوازن حکومت قائم کر رکھی تھی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے یہ داستان مکمل ہو جاتی ہے۔

(۰)

انسانیت سوز اور لرزہ انگیز مظالم

سابقہ اشاعت میں ہم نے لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز کے رپورٹر مسٹر (MASCARENHAS) کی اس رپورٹ کا

ایک حصہ درج کیا تھا جو اس اخبار کی ۲ مئی کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا حصہ جو وہاں کے مظالم کی تفصیل پر مشتمل تھا، ہم نے حذف کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر ملکوں کے رپورٹر بالکلیہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے؛ اور ہماری حکومت کی طرف سے نہ تو از خود ان واقعات کی تفصیل شائع کی گئی تھی اور نہ ہی محولہ بالا رپورٹ کی تصدیق کی گئی تھی ـــــ ان رپورٹرز کے غیر معتمد ہونے کا ایک بین ثبوت حال ہی میں سامنے آگیا ہے۔ اسی رپورٹر نے اسی اخبار کی ۱۳ جون کی اشاعت میں ایک اور رپورٹ شائع کی ہے جس کا بیشتر حصہ اس کی سابقہ رپورٹ کے خلاف ہے۔ حکومتِ پاکستان کے ایک نمائندہ نے اس کی اس رپورٹ کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی ۲ مئی والی رپورٹ صحیح تھی۔ چونکہ اس کی ۲ مئی کی رپورٹ کی تصدیق حکومتِ پاکستان کے نمائندہ کی طرف سے کی گئی ہے اس لئے ہم اس کا وہ حصہ بھی شائع کرتے ہیں جسے پہلے حذف کر دیا گیا تھا اور جس کا تعلق سبعیت و بہیمیت کے ان شرمناک اور جگر پاش واقعات سے تھا جو مشرقی پاکستان کے درندوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ہم ان الفاظ کو ایک بار پھر سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں جنہیں سابقہ اشاعت میں لکھا گیا تھا۔ وہ الفاظ یہ تھے۔

> اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ان واقعات کو "بنگالی اور غیر بنگالی" کے تصادم سے تعبیر کرنا حقیقت سے چشم پوشی کے مرادف ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ جب اور جہاں اور جس قوم میں لاقانونیت کو عام کیا جائے گا وہاں اسی قسم کے واقعات رونما ہوں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ چند افراد اپنے مخصوص مذموم مقاصد کے حصول کے لئے، انسانوں کے گروہوں میں نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں اور جب یہ آگ عام ہو جاتی ہے تو انسان، انسان نہیں رہتا، درندہ بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہر اس فرد یا گروہ کے ساتھ جسے وہ اپنا مخالف سمجھتا ہے وہی کچھ کرتا ہے جو مشرقی پاکستان میں ہوا۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ملک میں لاقانونیت کے رجحان کو روکا جائے۔

اس تنبیہہ کے بعد آپ ان مظالم کی دہشت انگیز روئداد ملاحظہ کیجئے جو اس رپورٹر کی ۲ مئی کی رپورٹ میں مذکور ہے اور جس کے صحیح ہونے کی تصدیق حکومتِ پاکستان کے نمائندہ نے بھی کر دی ہے۔ (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۳ جون)۔

"(ان ہنگاموں میں) زندہ انسانوں کی آنکھیں نکالی گئیں۔ مردوں اور عورتوں کو سرِعام کوڑوں سے پیٹا گیا، عورتوں کی چھاتیاں کاٹی گئیں اور جو لوگ ان کے قابو آگئے انہیں گولیوں یا سنگینوں سے ذبح کرنے سے پہلے ان کے اعضا بُری طرح کاٹے گئے۔ فوج کے پنجابی افسروں اور غیر بنگالی سول کے ملازمین اور ان کے بیوی بچوں کو اس طرح وحشت اور درندگی کے ساتھ قتل کرنے کے لئے خاص طور پر چنا گیا۔ چاٹگام میں ملٹری اکادمی کے کرنل کمانڈنٹ کو گولی سے اڑا دیا گیا اور اس کی آٹھ ماہ کی حاملہ بیوی کی پہلے عصمت دری کی گئی اور پھر اس کے پیٹ میں سنگینوں کے کچوکے دے دے کر (اسے تڑپا تڑپا کر) مارا گیا۔ چاٹگام کے ایک دوسرے حصے سے، ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک افسر کی زندہ کھال کھینچی گئی۔ اس کے لڑکوں کے سرتن سے جدا کئے گئے اور اس کی بیوی کے پیٹ میں سنگینیں گھونپ گھونپ کر اس طرح مارا گیا کہ اس کے بچے کا سر اس کے برہنہ جسم کے اوپر دھرا گیا۔ بہت سی نوجوان لڑکیوں کی لاشیں اس حالت میں ملیں کہ بنگلہ دیش کے جھنڈے کی ڈنڈیاں ان کی شرمگاہوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ (اُف ۔!!)

چاٹگام اور کھلنا میں مغربی پاکستان کے باشندے زیادہ تعداد میں تھے اس لئے سب سے زیادہ تباہی انہی شہروں میں مچائی گئی۔ چاٹگام میں مقتول سرکاری افراد کی تعداد نو ہزار کے قریب پہنچی ہے اور کم و بیش اتنی ہی تعداد کھلنا کی ہے۔ قتل و غارت گری کے ہولناک واقعات کی رپورٹیں دیگر مقامات سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ دیناج پور کے قریب، ٹھاکر گاؤں

کے مقام پر قریب تین ہزار ذبح شدہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں ملی ہیں۔ جیسور کے قریب ایڈگردی کے مقام پر قریب دو ہزار، ڈھاکہ کے شمال مشرق میں بھیراب بازار کے قریب پانسو۔ اور کالوگھاٹ کے علاقہ میں پٹ سن کے کارخانہ کے ایک شیڈ کے نیچے سے (۲۵۳) لاشیں ملی ہیں۔ بھارتی صوبہ تری پورہ کے اس پار برہمن باڑیا کے مقام پر میں نے (۸۲) بچوں کی لاشیں دیکھیں۔ جنہیں ایک لائن میں کھڑا کر کے گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ایک جیل خانے کے ارد گرد میں نے قریب تین سو غیر بنگالیوں کی نعشیں دیکھیں جنہیں بنگالی مجرموں کو آزاد کرنے کے بعد اسی جیل میں رکھا گیا تھا۔ باغیوں نے انہیں اس وقت گولی ماری تھی جب وہ خود پاکستانی فوج کی آمد پر بھاگ رہے تھے۔"

عالمگیر تباہی

ہمعصر جریدہ ایشیا (لاہور) نے اپنی ۴ جولائی کی اشاعت میں مشرقی پاکستان کی ایک رپورٹ شائع کی ہے جسے (مولانا) متین ہاشمی اور محمد شبلی مظہری صاحب نے مرتب کر کے بھیجا ہے۔ ہم اس رپورٹ کے جستہ جستہ اقتباسات دل پر پتھر رکھ کر درج ذیل کرتے ہیں:-

(۱) سنتاہار

شب کی تاریکی میں ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹ، بھارتی مداخلت کار اور مقامی آبادی کے علیحدگی پسند غنڈے مل کر سنتاہار کی آبادی پر آسمانی بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ حملہ آوروں کے پاس خودکار رائفلوں کے علاوہ ہلکی اور بھاری مشین گنیں بھی موجود تھیں۔ مقامی غنڈے پہلے ہی نیزوں، خنجروں اور دوسرے آتشیں ہتھیاروں سے لیس تھے۔ مقابلہ کرنے والوں میں اکثر تو پہلے ہی ہلے میں ختم کر دیئے گئے جو باقی رہ گئے وہ نہتے تھے۔ بھاگ بھاگ کر گھروں اور مسجدوں میں چھپنے لگے مگر حملہ آور انہیں ڈھونڈ کر لاتے، پہلے ان کی آنکھیں نکالتے اور پھر نہایت صفائی سے ذبح کر دیتے۔ معصوم بچوں کو ماؤں کی آغوش سے چھین کر ذبح کرتے۔ مردوں کا بالکل خاتمہ ہو چکا تو عورتوں کی باری آئی۔ ظالموں نے تمام عورتوں کو گھروں سے نکال کر ایک کھلی جگہ جمع کرنا شروع کیا۔ تقریباً ایک ہزار عورتیں بڑی مسجد میں پناہ لئے ہوئے تھیں جب انہوں نے مسجد سے نکلنے سے انکار کیا تو انہیں مسجد کے اندر ہی گولی مار دی گئی۔ ہزاروں لاشیں اوپر نیچے گریں اور خانہ خدا مظلوموں کی لاشوں سے بھر گیا۔ مسجد میں خون کا سیلاب آگیا۔ کئی روز تک یہ لاشیں بے گور و کفن مسجد ہی میں پڑی رہیں چنانچہ پاک فوج کے قبضے کے بعد بھی کئی دن تک مسجد سے اذان کی آواز بلند نہ ہو سکی۔

جن عورتوں کو میدان میں جمع کیا گیا تھا ان میں زیادہ عمر کی عورتوں کو پہلے ہی لائن میں کھڑی کر کے گولی مار دی گئی۔ پھر نوجوان اور کمسن لڑکیوں کی باری آئی۔ انہیں برہنہ رقص کرنے اور بنگلہ دیش کے نعرے لگانے پر مجبور کیا گیا۔ ان سے برہنہ جسموں پر جھولے کے کچھ دیگر احکام کی بجا آوری کرائی گئی۔ اس کے بعد وہ وحشیانہ سلوک ہوا کہ شرافت کی زبان جس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ تقریباً سات روز بعد جب پاک فوج اس علاقے میں پہنچی تو ہزاروں نوجوان لڑکیوں کی بالکل عریاں لاشیں بنگلہ سکول میں پڑی ہوئی ملیں جن میں اکثر کے صنفی اعضاء کٹے ہوئے تھے اور......

سڑکوں، گلیوں اور گھروں میں لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ بعض کوارٹروں میں پانچ پانچ سو لاشیں پائی گئیں ہیں

نے کئی ایک عینی شاہدوں سے ملاقاتیں کی ہیں جو اس قیامتِ صغریٰ میں قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ "سنتاہار کی پوری آبادی میں بمشکل چند سو نفوس بچے ہیں جنہوں نے ہماری طرح چھپ چھپ کر جانیں بچائی ہیں ورنہ باغیوں نے تو اپنی طرف سے کوئی بچہ بھی باقی نہیں رہنے دیا۔ جن بنگالی مسلمانوں نے باغیوں کے آلہ کار بننے سے انکار کیا اور مظلوم مہاجروں اور غیر مقامی آبادی کے لوگوں کو پناہ دینے کی کوشش کی ان میں سے بھی بیشتر کو اپنی عزت اور جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

(۲) دیناج پور

۱۰ اپریل کو دیناج پور میں فساد کا آغاز ہوا اور ۱۵ اپریل تک صرف پانچ روز میں یہ ہنستا مسکراتا شہر موت کی نیند سو گیا۔ ۴۰ ہزار مرد، عورتیں اور بچے یہاں شہید کئے گئے۔ چار سو نوجوان لڑکیوں کو ہندوستان پہنچایا گیا۔ سرِ بازار باعفت خواتین کو برہنہ کیا گیا۔ اور ان کی عصمت دری کی گئی۔ مانتبال ہائی اسکول میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے، بچوں کو نکالا گیا اور انہیں پاؤں تلے کچلا گیا۔ کمسن لڑکوں کے دونوں ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑ دیا گیا۔ اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ زندہ انسانوں کی کھال بالکل اس طرح اتاری گئی جس طرح بکرے کی کھال اتاری جاتی ہے اور پھر جسم پر نمک مل کر اذیت ناک موت کا تماشا دیکھا گیا۔ زخمیوں نے عالمِ نزع میں پانی مانگا تو منہ میں پیشاب کر دیا گیا۔ اگر کسی نے اپنی جان بچانے کے لئے قرآن اٹھا لیا تو اس کے ہاتھوں سے قرآن اٹھا کر زمین پر پھینک دیا گیا۔ کنچن ندی کے کنارے بستے لوگوں کو امن کمیٹی کی میٹنگ کے بہانے لے جایا گیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر جانوروں کی مانند ذبح کیا گیا۔

فوج کے آجانے کے بعد یہاں بے شمار ایسے معصوم بچوں کی لاشیں ملیں جن کے سر کاٹ کر الگ پھینک دیئے گئے تھے۔ یوں دیناج پور کی ہنستی کھیلتی آبادی والے شہر کی پُرامن زندگی خون کے سمندر میں ڈوب گئی۔ بمشکل چند ہزار مرد اور عورتیں ایسی ہوں گی جنہوں نے ظالموں کی نگاہوں سے چھپ کر اپنی جانیں بچا لیں۔ ۱۵ اپریل کو فوج کے مکمل کنٹرول کے بعد فوج نے یہاں ہزاروں لاشوں کو پاربتی پور اور سید پور کے لوگوں کے تعاون سے دفنایا۔ لیکن لاشوں کی اتنی کثرت تھی کہ ۲۶ اپریل کے بعد بھی کئی جگہوں میں متعفن لاشیں نظر آتی رہیں۔

میں نے خود ایک گھر میں دیکھا کہ ایک لاش پڑی تھی جس کی کھال سڑ گئی تھی مگر اس کے پاس پڑے ہوئے کپڑے اور زنانہ جوتے بتا رہے تھے کہ وہ میری بے کس قوم کی کوئی مظلوم بچی تھی جس کے جسم کو نیزوں کی انیوں اور خنجروں کے کچوکوں سے خاک و خون میں تڑپایا گیا تھا اور اب مدتوں سے اسکا بے گور و کفن خاک آلودہ لاشہ یوں پڑا ہوا مظلومیت کی داستان سنا رہا تھا۔

(۳) پونچاگڑھ

یہ جگہ بھی ضلع دیناج پور میں واقع ہے۔ یہاں تقریباً پانچ ہزار غیر بنگالی آباد تھے۔ سارے کے سارے شہید کر دیئے گئے۔ صرف پچیس افراد زندہ بچے ہیں جن میں سے صرف چار مرد ہیں۔ باقی بیوہ عورتیں اور بچے ہیں۔ یہاں بھی آبروریزی اور اغوا کے نہایت شرمناک واقعات پیش آئے۔ خوبصورت عورتوں اور لڑکیوں کو بنگالی مسلمانوں نے بھارت پہنچایا۔"

(۴) شتاب گنج

تقریباً سات ہزار کی یہ لہلہاتی ہوئی بستی مارچ کے اخیر و اپریل کے ابتدائی عشرے میں قبرستان بن گئی۔ اب شتاب گنج خاموش ہے۔ کل ڈیڑھ سو بیوہ عورتیں اور یتیم بچے زندہ بچے ہیں جو نیلی فام آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنے شوہروں اور والدین کا انتظار کر رہے ہیں۔ شتاب گنج کے متصل ایک بستی بھیر گنج نام کی ہے۔ یہاں سات سو غیر بنگالی مہاجر کاشتکار

تھے۔ سارے کے سارے شہید کر دیئے گئے۔ صرف چار بوڑھے مرد اور تین بچے زندہ بچے ہیں۔ مقتولین کو قتل کرنے سے قبل ایک میدان میں لا کر کھڑا کیا گیا۔ اور پھر ان کے سامنے ان کی مادر زاد ننگی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کا جلوس لایا گیا۔ انہیں کے سامنے ان کی عصمت دری کی گئی اور پھر پہلے مردوں کو اور اس کے بعد عورتوں کو شہید کر دیا گیا۔ یہی طریق کار مانک گنج، بیر گنج شیخ میں بھی اختیار کیا گیا۔

(۵) دیناجپور کے دیگر مضافاتی علاقے

یہاں ظلم و بربریت کے عجیب عجیب مناظر عوامی لیگی کارکنوں اور ای۔ پی۔ آر کے ہاتھوں دیکھنے اور سننے میں آئے مثلاً ایک عمارت میں لوگوں کو حفاظت کرنے کے بہانے بند کر دیا گیا اور سات دنوں تک بے دانہ پانی رکھ کر زندہ آدمیوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ چند لوگوں کے منہ میں پٹرول ڈال کر آگ لگا دی گئی جس کی وجہ سے مغز سمیت کھوپڑیاں اڑ گئیں۔

(۶) خالص پور (کھلنا)

۲۵ مارچ سے یہاں فضا خراب ہونی شروع ہو گئی تھی اور غیر بنگالی لوگ محفوظ علاقوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن مقامی بنگالی انہیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ آپ لوگ مل ایریا کے باہر نہ جائیں، ہم آپ کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کریں گے۔ سیدھے مسلمانوں نے منافقوں کی قسموں پر اعتبار کر لیا اور مل ایریا میں ٹھہرے رہے ۲۸ مارچ کو قرآن اٹھا کر قسمیں کھانے والوں اور باغیوں کے دوسرے جتھوں نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ کریسنٹ اور پیپلز مل میں باقاعدہ الگ الگ عصمت دری کے مراکز اور قتل گاہیں بنائی گئیں۔ تاکلٹ گرلز ہائی اسکول کی ایک استانی نشاط افزا کی روایت کے مطابق۔

"کریسنٹ مل کے گودام کو آگ لگا دی گئی۔ دوسری طرف دریا تھا اور گیٹ پر ای۔ پی۔ آر کے مسلح سپاہی گولیاں برسا رہے تھے۔ قیامت کا سماں تھا مردوں کو قتل کرنے کے بعد عورتوں کو کسٹم آفیسر کے بنگلے میں لے جایا گیا۔ اس بنگلے میں عصمت دری کے لئے تین کمرے مخصوص تھے۔ تین قتل گاہیں تھیں۔ ایک قتل گاہ بچوں کی ایک بوڑھی عورتوں کی اور ایک بھنبھوڑی ہوئی نوجوان عورتوں کی۔ . . . . ایک ایک مظلوم عورت کو دس دس مردوں کے حوالے کر دیا جاتا اور کہا جاتا کہ یہ تمہارا حصہ ہے اور وہ وحشی بھیڑیئے ان کو اچھی طرح بھنبھوڑنے کے بعد گولی کا نشانہ بنا دیتے تھے"

آج خالص پور ایک اجڑے دیار کا نام ہے جہاں قتل گاہوں میں لٹی ہوئی جوانیوں اور مٹی ہوئی زندگیوں کے آثار کے سوا اور کچھ باقی نہیں ہے۔ یہاں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، خون آلود ساڑھیوں، بچوں کے ننھے منے کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ صرف خالص پور کے علاقے میں پانچ ہزار مہاجر شہید ہوئے اور تین کروڑ کی املاک تباہ ہو گئیں۔

---

(۸)

یہ ہے اس شخص کے جرائم کی ایک ہلکی سی جھلک جسے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کس لقب سے پکاریں۔ ہلاکو اور چنگیز کے نام اس کے مقابلہ میں فرسودہ دکھائی دیتے ہیں اور امریکیوں اور نازیوں کی دہشت سامانیوں کی داستانیں قصۂ پارینہ۔ اس کے نام سے جسدِ ملت میں خون کھولنے لگتا ہے اور اس کے تصور سے سینوں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ہم نے (طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۱ء میں) یہ بتانے کے بعد کہ قرآن کریم کی رو سے مملکت کے باغیوں کی سزا کیا ہے، اربابِ نظم و نسق کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ

ضروری ہے کہ ان مجرمین کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے . . . . اس قسم کے مجرموں کا زندہ رکھنا بڑے خطرات کا موجب ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جب اتنی اتنی بڑی خارجی طاقتیں ان کی پشت پناہ ہوں اور وہ "بنگلہ دیش" کی آزاد حکومت کو متشکل اور تسلیم کرنے کے منصوبے بنا رہی ہوں۔

ہم اس عرضداشت کو پھر دہراتے ہیں اور اس پر اتنا اضافہ اور ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ چیز حکومت کی بہی خواہی اور مملکت کے ساتھ وفاشعاری کے منافی ہوگی اگر ہم اس حقیقت کا اظہار نہ کریں کہ مجیب اور اس کے رفقاء کا انجام دیکھنے کے لئے قوم سراپا انتظار ہے اور وہ یکسر آسمان کی طرف تکتی اور بلند آواز سے پکار پکار کر کہتی ہے کہ

دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

(تحریر مورخہ ۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۷۱ء)

شاہد عادل

اسلامی ریاست میں رہائشی مکانات کی ملکیت

طلوع اسلام کے شمارہ بابت اپریل ۱۹۷۱ء میں "اسلامی ریاست میں زمین کی ملکیت" کے بارے میں شرعی احکامات کی تفصیلات پیش کی گئی تھیں جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ دورِ رسالت سے لے کر خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے تک ہر قسم کی اراضی ریاست کی تحویل میں رہتی تھی۔ تاہم اس اراضی پر افراد کو ایسے قابضانہ حقوق حاصل تھے جن کی بنا پر وہ نسلاً بعد نسلٍ انہی کے خاندان میں رہتی، جس کی وجہ سے بعض اوقات یہ گمان ہوتا کہ شاید وہ ان کی ذاتی ملکیت ہے۔ لیکن چونکہ اسلامی ریاست میں زمین کی کسی قسم کی خرید و فروخت کی اجازت نہ تھی، اس لئے اس قسم کی غلط فہمی دیرپا ثابت نہ ہوتی۔

اسی ضمن میں رہائشی مکانات کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا تھا۔ اگرچہ ان کی شرعی حیثیت بھی وہی تھی جو برصغیر پاک و ہند کی زرعی اراضی کی تھی، تاہم اس مسئلہ کی کچھ تفصیلات ایسی تھیں کہ اگر انہیں اسی مقام پر زیرِ بحث لایا جاتا تو غلط بحث کا امکان تھا۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اسے علیحدہ مضمون میں ہدیۂ قارئین کیا جائے۔

اراضی کی شرعی حیثیت

ان تفصیلات کو پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اراضی سواد جس میں برصغیر پاک و ہند کی اراضی بھی شامل ہیں، کے بارے میں اسلامی قانون کا وہ فیصلہ ایک دفعہ پھر سامنے لایا جائے جس پر صدرِ اسلام سے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے تک عمل ہوتا رہا ہے۔ علامہ شامی کے الفاظ میں:

قال فی ردّ المختار انّ اراضی بیت المال المسماۃ باراضی المملکۃ و اراضی الحوز اذا کانت فی ایدی زراعھا لا تنزع من ایدیھم ما داموا یؤدون ما علیھا و لا تورث عنھم اذا ماتوا ولا یصحّ بیعھم لھا ولکن جری الرسم فی الدولۃ العثمانیۃ انّ من مات عن ابنٍ انتقلت لابنہ مجاناً والّا فلبیت المال ولو لہٗ بنت۔

(شامی لابن عابدین ـ جلد ۳ ـ صفحہ ۳۵۴)

(ترجمہ) رد المختار میں ہے کہ بیت المال کی اراضی جنہیں سرکاری اراضی یا اراضی حوز بھی کہا جاتا ہے، جب وہ کاشتکاروں کے قبضہ میں ہونگی تو وہ جب تک اس کا خراج ادا کرتے رہیں، ان سے چھینی نہیں جا سکتیں، اور نہ ہی ان کی وفات پر وراثت میں تقسیم ہونگی، اور نہ ہی انہیں بیچا جا سکتا ہے۔ اور عثمانی حکومت میں اس پر عمل تھا کہ جو کاشتکار اپنی وفات پر نرینہ اولاد چھوڑ جاتا تو وہ زمین اس کے لڑکے کو منتقل ہو جاتی تھی اور اگر اس کی صرف بیٹی ہوتی تو وہ زمین خود بخود بیت المال کو واپس ہو جاتی۔

اس سلسلے میں ہم نے علماء ہند کے فتاویٰ بھی نقل کئے تھے جن کے مطابق برصغیر ہند و پاک کی اراضی کی شرعی حیثیت بھی وہی تھی جو ارض السواد (یعنی عراق و ایران) کی تھی۔ اور یہ کہ اراضی کی اس شرعی حیثیت کا اطلاق رہائشی قطعات پر بھی ہوتا تھا جیسا کہ خطیب بغدادی کے حوالے سے ہم نے فقہاء کا یہ فیصلہ نقل کیا تھا۔

وَمَنَعَ جَمَاعَةٌ مِنَ العلماءِ من بيع ارض بغداد لكونها من ارض السواد و ارض السواد عندهم موقوفة لا يصحّ بيعها ۔ (تاریخ بغداد جلد اول۔ صفحہ)

علمائے اسلام کی ایک جماعت نے بغداد کی زمین کی خرید و فروخت ناجائز قرار دی ہے کیونکہ وہ ارض سواد ہے (یعنی وہ غیر عرب علاقے جو مسلمانوں نے فتح کئے) کیونکہ ان کے فیصلے کے مطابق ایسی اراضی مسلمانوں کے لئے وقف ہے (یعنی اسلامی ریاست کی ملکیت ہیں) اس لئے ان کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

چنانچہ اس اصولی حکم کی روشنی میں مکانوں کی خرید و فروخت کی بھی اجازت نہ تھی۔ ہاں اگر کوئی شخص نقل مکانی یا کسی اور وجہ سے اپنا مکان چھوڑنا چاہتا تو اسے صرف مکان کا ملبہ فروخت کرنے کا حق حاصل ہوتا۔ رہائشی زمین کا قطعہ خود بخود ریاست کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا۔ فقہاء کے الفاظ ہیں۔

بل رأوا أن تباع الانقاض دون الارض ۔ (ایضاً)

(ترجمہ) بلکہ ان فقہاء نے یہ رائے دی کہ زمین بیچنے کی اجازت تو نہیں ہاں مالک اپنے مکان کا ملبہ فروخت کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی ریاست میں اراضی چاہے وہ زرعی تھی یا رہائشی، کی خرید و فروخت کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ خود ریاست جس کی تحویل میں یہ سب کچھ ہوتا تھا، کو بھی کسی قسم کے تصرف کی مجاز نہیں تھی۔

مکانوں کی قلت

آج مکانوں کی قلت کا مسئلہ ایسی نازک صورت اختیار کر چکا ہے کہ اس کی بابت کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ دراصل مکانوں کی قلت کی بنیاد تو اسی وقت سے پڑ چکی تھی جب معاشرے میں زمین کی خرید فروخت کے نظام نے ترقی کی۔ صاحب ثروت لوگ بڑے بڑے قطعات اراضی خرید کر اپنے لئے شاندار محل تعمیر کرنے لگے۔ لیکن لاکھوں نادار جو زمین خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، سر چھپانے کی جگہ سے بھی محروم ہونے لگے۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ سرمایہ داری نظام میں جس طرح سرمایہ دار کی ہوس تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے، اس کا اثر مکانات کے مسئلہ پر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ چنانچہ مستقبل میں زیادہ نفع کمانے کے لالچ میں سرمایہ دار بڑے بڑے رہائشی قطعات خرید کر روک لیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک تو حقیقی ضرورتمند ان کے حصول سے محروم ہو جاتے ہیں اور دوسرے ان روکے ہوئے رہائشی قطعات کے من مانے دام وصول کئے جاتے ہیں۔ یہ سمجھنے سمجھانے کی بات ہے کہ کم از کم ہر دس سال کے بعد ان قطعات کی قیمت دوگنی ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں کسی نادار کے لئے مکان بنانا تو کجا سرے سے رہائشی قطعہ حاصل کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے اس صورت حالات سے ایک اور طرح فائدہ اٹھایا۔ وہ یوں کہ اپنے سرمایہ کی مدد سے مکانات تعمیر کر کے کرایہ پہ دے دیئے اور اس طرح محنت کشوں کی آمدنی کا ایک کثیر حصہ مکان کے کرایہ کی صورت میں ان کی نذر ہونے لگا۔ سرمایہ داروں کا یہ سرمایہ اگر بنکوں میں جمع ہوتا تو معمولی شرح کے حساب سے سود ملتا لیکن اس صورت میں تعمیر شدہ مکانوں کے کرایہ کی صورت میں وہ کئی گنا زیادہ وصول کرنے لگے۔

مکانات کے کرائے

یہاں ایک اور ضمنی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں جہاں سرے سے ہر قسم کی اراضی کی ہی خرید و فروخت کی اجازت نہیں، مکانوں کے کرائے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ مکانات کے کرائے کی آمدنی چونکہ بغیر محنت کے حاصل ہوتی ہے، اس لئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہ سود ہی کی ایک قسم قرار پاتی ہے۔ آج بھی اس مد کی آمدنی کو ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ربٰوا یعنی سود ہی کی تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً اگر دس ہزار روپیہ بنک میں جمع کرا کے اس کا سود لیا جائے تو یہ ہمارے علماء کے ہر طبقے کے نزدیک ناجائز قرار پا جائے گا۔ لیکن اگر اسی دس ہزار روپے کا مکان خرید کر یا تعمیر کر کے سود سے بھی زیادہ کرایہ وصول کر لیا جائے تو ان حضرات کے فتوے کی رو سے یہ بالکل حلال و طیب ہوگا۔ — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے —

ہم نے پچھلے مقالے میں وضاحت سے بیان کیا تھا کہ صدرِ اسلام اور بعد کے زمانوں میں دیہات وغیرہ میں تو مکانات کے کرائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا، البتہ بڑے بڑے شہروں میں، خاص طور پر وہ جو بین الاقوامی حیثیت رکھتے تھے، یہ مسئلہ موجود تھا۔ دورِ رسالت میں مکہ معظمہ کو کچھ ایسی ہی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ آپ نے وہاں کے مکانات کرائے پر اٹھانے سے منع فرمایا۔

عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مكة مناخ لا تباع رباعها ولا تؤاجر بيوتها - (احکام القرآن للجصاص - جلد ۳ - صفحہ ۲۸۳)

(ترجمہ) حضرت عبد اللہ بن عمرو رض سے روایت ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ مکہ معظمہ آرامگاہ ہے اس کے مکان نہ فروخت کئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کرائے پر دیئے جا سکتے ہیں۔

بلکہ ایک دوسرے مقام پر آپ نے اسے واضح الفاظ میں سود ہی قرار دے دیا:۔

من اكل كراء ارض مكة فكانما اكل الربوا - (ہدایہ مطبوعہ دہلی - جلد ۴ صفحہ ۴۵۲)

(ترجمہ) جس نے مکہ معظمہ کے مکانوں کا کرایہ کھایا اس نے گویا سود کھایا۔

مسئلہ کا اسلامی حل

اب ملاحظہ فرمائیے کہ اسلام اس پیچیدہ مسئلہ کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ بعض صورتوں میں اسلامی تعلیمات میں معاشی درجات کے تفاوت کی گنجائش ملتی ہے[1] لیکن رہائشی مکانات کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس میں اسلام مکمل مساوات کا علمبردار ہے، اور حضور صلعم اس بارے میں اس سختی سے عمل کرتے تھے کہ اگر کوئی صحابی رض دوسرے صحابہ رض کے مقابلے میں (بطور تفاخر) اپنے مکان کو بلند کرا لیتا تو آپ اس کے سلام تک کا جواب دینا پسند نہ فرماتے۔ بالاخانہ تعمیر کرنے والے اس صحابی کا قصہ تو مشہور ہے کہ جس نے آپ کی ناراضگی محسوس کرتے ہوئے اسے گرا دیا تھا۔ اس بارے میں آپ نے جو کچھ فرمایا وہ حضرت علی رض کی زبانی سنیئے:۔

من بنى بنيانا رياءً وسمعةً حمله يوم القيامة من الارض السابعة وهو نارٌ تشتعل ثم يطوق في عنقه ويلقى في النار فلا يحبسه دون قعرها الا ان

[1] مثلاً امور مفوضہ کی سر انجام دہی کے سلسلہ میں ضروریات، اور ان ضروریات کے پورا کرنے کے لئے معاشی اسباب و وسائل میں تفاوت۔ (طلوع اسلام)

یثوب - قیل یا رسول اللہ کیف یبنی ریاءً و سمعۃ قال یبنی فضلاً علی ما یکفیہ استطالۃً منہ علی جیرانہٖ ومباھاۃً لاخوانہ۔

(من لا یحضرہ الفقیہ از ابوجعفر۔ جلد ۴ صفحہ)

(ترجمہ) جس نے دکھلاوے اور شان و شوکت کے لئے مکان بنایا، تو قیامت کے دن وہ اسے ساتویں زمین سے اس صورت میں اٹھائے گا کہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی جسے اس کے گلے میں ڈال کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور وہ کہیں ٹھہر نہ سکے گا۔ یہاں تک کہ وہ اس کی گہرائیوں میں جاگرے گا۔ ہاں اگر وہ توبہ کرے تو اس عذاب سے بچ جائے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ دکھلاوے اور شان و شوکت کے لئے بنائے جانے والے مکان کی کیا پہچان ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنی ضروریات سے زیادہ مکان اس لئے بناتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں پر رعب جما سکے اور اپنے بھائیوں پر فخر کر سکے۔

آج کے معاشرے میں بعض اذہان کو یہ فرمانِ نبویؐ شاید کچھ عجیب سا معلوم ہو کیونکہ ہمارے ہاں معاشی طبقات شرعی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ہمارے علماء نے مذکورہ بالا قسم کے فرمودات نبوی تو شاید ہی کبھی بیان کئے ہوں؛ البتہ اسلام کے نام پر عامۃ الناس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ دولت مندی اور غربت اللہ کی طرف سے ہے۔ غریبوں کو امیروں کی دولت یا شاندار کوٹھیوں سے کوئی بغض نہیں رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ دنیاوی چیزیں ہیں اور جنت میں زیادہ تر غرباء ہی جائیں گے۔ ہاں دولتمند اگر اپنی دولت کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کر دیں تو ان کی تمام دولت پاک ہو جائے گی۔ پھر چاہے وہ اس سے محل کھڑے کریں یا اسے عیش و عشرت میں اڑا دیں۔

عیش و عشرت کی زندگی

سادہ اسلامی سوسائٹی میں اس قسم کے وعظ و تلقین ہی سے تو عیش و عشرت کی بنیاد پڑی اور یہی عیش و عشرت ہی من حیث القوم ان کے زوال کا سبب بنی لیکن اس کے باوجود ہمارے صاحبِ ثروت لوگ اس راستے سے ہٹنے پر تیار نہ ہوئے حالانکہ حضور صلعم جب بھی کہیں اس کی ذرا سی بو باس محسوس فرماتے، تو ان لوگوں کی یوں خبر لیا کرتے تھے۔

شرار امتی ولدوا فی النعیم وغذوا بہ یاکلون من الطعام الواناً ویلبسون من الثیاب الواناً و یرکبون من الدواب الواناً ویتشدقون فی الکلام۔ (یہ روایت الحاکم اور مستدرک میں عبداللہ بن جعفرؓ کی روایت سے منقول ہے۔ اور شعب الایمان میں امام بیہقی نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ صلعم کی زبانی معمولے سے لفظی اختلاف سے بیان کی گئی ہے)

(ترجمہ) میری امت کے بدترین افراد وہ ہیں جو نعمتوں کی گود میں پیدا ہوئے اور اسی میں پروان چڑھے۔ قسم قسم کے کھانے کھاتے ہیں۔ طرح طرح کے لباس پہنتے ہیں۔ قسم قسم کی سواریاں (یعنی نئے نئے ماڈل کی کاریں) استعمال کرتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔

قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب اسلامی معاشرہ میں سرے سے عیش و عشرت ہی کی ممانعت ہوگی تو محلات اور شاندار کوٹھیوں کا وجود کہاں سے آسکے گا۔ اس سے یہ خیال پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلامی معاشرے میں کمانے پر کوئی پابندی عائد ہوگی۔ ہاں اس کمائی کی آمدنی کو ذاتی مقاصد کے لئے خرچ کرنے پر ضرور پابندی تھی۔ اور فرمودات نبویؐ جن میں

سے کچھ کی جھلک اوپر دکھائی گئی ہے، کی روشنی میں یہ پابندی اتنی خوش آیند تھی کہ اس معاشرے کے افراد زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتے اور اپنی ذات پر کم از کم خرچ کرتے تھے۔

دولت پر حد

آپ نے اسلامی معاشرے میں عیش و عشرت کے خاتمے کے لئے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ہمیشہ کے لئے اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت کی ایک حد مقرر کر دی تھی اور پھر اس حد سے تجاوز کرنے والوں کو سخت سے سخت وعیدیں سنائیں۔

روی حماد بن سلمة عن طلحة بن عبد اللہ بن کریز عن ابی العنیف عن ابی هریرة ان النبیؐ صلی الله علیه وسلم قال من ترک عشرة الاف درهم جعلت صفائح یعذّب بها یوم القیامة ۔ (احکام القرآن از قاضی ابوبکر جصاص جلد ۳ صفحہ ۱۱۲)

(ترجمہ) حماد بن سلمہ نے طلحہ بن کریز سے روایت کیا ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ جس نے اپنی موت کے وقت دس ہزار درہم ترکے میں چھوڑے تو وہ چوڑے پتھر بنا دیئے جائیں گے، جن کے ساتھ قیامت کے دن اسے سخت عذاب دیا جائے گا۔

یہ دولت کے اکتناز کو روکنے کے پروگرام کی تدریجی کڑیاں تھیں جن سے رفتہ رفتہ اس قرآنی منتہیٰ تک پہنچنا مقصود تھا جس میں (خود حضورؐ کے اسوہ کے مطابق) ترکہ میں روپیہ پیسہ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نگاہِ بازگشت

مضمون کے اختتام سے پہلے تفصیلاتِ گذشتہ پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالتے جایئے۔

(۱) اسلامی ریاست میں ہر قسم کی اراضی چاہے وہ زرعی ہو یا رہائشی، کی خرید و فروخت کی اجازت نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ خود اسلامی ریاست کو بھی ایسا حق حاصل نہیں ہوگا۔

(۲) جو شخص نقل مکانی کرنا چاہے گا، وہ صرف اپنے مکان کا ملبہ فروخت کرنے کا حقدار ہوگا۔ زمین کی ملکیت خود بخود ریاست کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ جب زمین کی سرے سے خرید و فروخت کی اجازت ہی نہ ہوگی، تو اس کی موجودہ آسمان سے باتیں کرنے والی قیمتوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔

(۳) اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اگرچہ بعض صورتوں میں معاشی تفاوت کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن مکانات کے سلسلے میں اسلام سختی سے مساوات کا حامی ہے۔ افرادِ معاشرہ کو مکانات کے لئے مفت زمین مہیا کی جائے گی جس[1] کی مقدار کا فیصلہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت کرے گی اور جب زمین مفت مہیا ہوگی تو نہ صرف سادہ لوح عوام کو لوٹنے والے پراپرٹی ڈیلرز کا وجود ختم ہو جائے گا بلکہ زمین سے متعلق لاکھوں مقدمات خود بخود ختم ہو جائیں گے، جن سے جرائم کے خاتمے میں مدد ملے گی۔

(۴) عیش و عشرت کی ممانعت اور دولت کی مناسب حد مقرر کر دینے کا لازمی نتیجہ مکانات کی سادگی کی صورت میں ہوگا۔

(۵) موجودہ معاشرے میں جہاں نئے بننے والے مکانات کے لئے مذکورہ بالا پالیسی اختیار کی جائے گی، وہاں پہلے سے موجودہ مکانات میں بھی اسی مساوات کے مطابق تبدیلی کی کوشش کی جائے گی۔ یعنی جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مکان ہوں گے، معاشرہ انہیں اپنی تحویل میں لے کر بے گھر لوگوں کا مسئلہ حل کرنے میں مدد دے گا۔

---

[1] آگے چل کر مکانات خود مملکت ہی تعمیر اور مہیا کرے گی۔ طلوعِ اسلام

حرفِ آخر

اسلام کے یہ احکامات بڑے واضح ہیں اور ان میں ابہام کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ صدیوں تک ان پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے اور اب بھی اسلامی لٹریچر میں ان کی پوری پوری تفصیلات موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی "مولانا" یا "لیڈر" ہو جو اسلام کا نام لئے بغیر نوالہ توڑتا ہو۔ لیکن حرام ہے جو کسی نے کبھی مساواتِ محمدیؐ کے ان احکامات کی طرف بھول کر بھی اشارہ کیا ہو، بلکہ وہ خود اسلام اور مساواتِ محمدیؐ کے نعرے لگاتے ہوئے محل نما کوٹھیوں کے حصول اور تعمیر میں برابر کے شریک ہیں۔ خیر ان لیڈر قسم کے حضرات کو تو چھوڑیئے، وہ "منظم جماعت" جس نے اسلامی نظامِ حیات پر لٹریچر سے الماریاں بھر دی ہیں، اس نے بھی اس موضوع پر کبھی ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا بلکہ خود اس کے لیڈر، صاحبِ ثروت لوگوں کی طرح بلا روک ٹوک انہی آسائشوں سے متمتع ہو رہے ہیں کہ جن کے استعمال کرنے والوں کو حضورؐ صلعم نے شرار امتی قرار دیا تھا۔

اب بھی وقت ہے کہ جا بجا موقعوں پر اسلامی نظامِ حیات کے نعرے بلند کرنے والے مساواتِ محمدیؐ کے اس خاص پہلو کی اہمیت کو اس حد تک اجاگر کر دیں کہ اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے نہ صرف مکانات کی قلت کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ اس کا دوسرے اہم امور و مسائل پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا اور اس سے مساواتِ محمدیؐ کی وہ چمک پیدا ہو گی جس سے سارا معاشرہ جگمگا اٹھے گا۔

طلوعِ اسلام

جیسا کہ ہم نے محترم صاحبِ قلم کے سابقہ مقالہ (شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۱ء) کے تمہیدی نوٹ میں لکھا تھا، ان کا انداز یہ ہے کہ یہ تاریخی اور فقہی تحقیقات سے اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ مسلمانوں کی سلطنتوں میں کس حد تک قرآنی تعلیم پر عمل ہوتا رہا اور اس کی عملی شکل کیا تھی۔ اس قسم کی تحقیق یقیناً اپنی خاص افادی حیثیت رکھتی ہے اور ضرور ہونی چاہیئے لیکن اس کے نتائج زیادہ سے زیادہ نظائر کا کام دے سکتے ہیں۔ فی ذاتہٖ غیر متبدل فیصلے قرار نہیں پا سکتے۔ ایک اسلامی مملکت میں غیر متبدل فیصلے تو خدا ہی کے ہو سکیں گے جنہیں اس نے اپنی کتابِ عظیم میں منضبط اور محفوظ کر دیا ہے۔ البتہ وہ ان فیصلوں کی عملی تنفیذ میں اس تحقیق سے بھی فائدہ اٹھائیں گی کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ان فیصلوں پر کس حد تک عمل ہوتا رہا اور اس کی عملی شکل کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ جب افرادِ مملکت کے لئے سکونت کا بہم پہنچانا بھی مملکت کے فرائض میں داخل ہو گا تو مکانات کی ذاتی تعمیر اور ان پر انفرادی قبضہ کا بھی سوال پیدا نہیں ہو گا۔ جنت میں مکان تو ہر ایک کے پاس ہو گا لیکن نہ وہ اسے کرایہ پر چڑھا سکے گا، نہ فروخت کر سکیگا۔

رشتہ مطلوب ہے

دہلی کے ایک معزز اور متوسط گھرانے کی ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ پاس، بر سر روزگار اور خانہ داری سے واقف دوشیزہ کے لیے "قرآنی فکر سے ہم آہنگ" پڑھے لکھے سلیم الطبع بارزگار لڑکے کا رشتہ مطلوب ہے۔ پہلے خط میں مکمل تفصیلات ارسال فرماویں۔

محمد اسلام۔ نمائندہ بزم طلوعِ اسلام - ۱۱/۱ فردوس مارکیٹ پہلی چورنگی ناظم آباد۔ کراچی

حقائق و عبر

دین اللہ یا دین الرسول

ادارہ تحقیقات اسلامی کے ترجمان، ماہنامہ فکر و نظر کی مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — قرآن کے سیاسی مبادیات — مقالہ نگار ہیں ڈاکٹر منظور الدین احمد اور مترجم ہیں نظیر حسین صاحب (ضمناً یہ نہیں بتایا گیا کہ مقالہ کس زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ شاید اصل مقالہ انگریزی زبان میں تھا)۔ اس مقالہ میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس کی زد دین کی اساسات پر پڑتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہمنے اس کا تعاقب ضروری سمجھا ہے۔ اس میں تحریر ہے

> دین کے معنی مذہب کے ہیں[1]۔ لیکن دین کا استعمال ملت سے وسیع تر معنوں میں ہوتا ہے۔ دین کی نسبت پیغمبر اور خدا دونوں کی طرف کی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں دین اللہ اور دین ابراہیم کی ترکیب متعدد جگہ آئی ہے۔ لیکن ملت اللہ کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نظر نہیں آیا۔ ملت کا تعلق فقط نبی سے ہے اور دین کی اضافت نبی اور اللہ دونوں کی طرف ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ "قرآن مجید میں دین اللہ اور دین ابراہیم کی ترکیب متعدد جگہ آئی ہے۔" متعدد جگہ" تو ایک طرف قرآن مجید میں کہیں ایک جگہ بھی "دین ابراہیم" کی ترکیب نہیں آئی۔ اور یہ بات حضرت ابراہیمؑ تک ہی محدود نہیں۔ قرآن مجید میں کہیں بھی دین کی نسبت کسی نبی کی طرف نہیں کی گئی۔ ہر جگہ دین کی نسبت خدا ہی کی طرف کی گئی ہے۔ اور یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ دین خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ رسول، خدا کے دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے اور خود بھی اس کا متبع ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی رُو سے دین کی نسبت یا اضافت نبی کی طرف نہیں کی جا سکتی۔

البتہ جب کوئی شخص یا قوم، خدا کے دین کو اختیار کرے، تو قرآن میں اسے "اس کا دین" (دینہٗ یا دینھم) کہا گیا ہے۔ اسی جہت سے ایک نبی بھی اُس دین کو دینی (میرا دین) کہہ سکتا ہے جسے وہ خدا کی طرف سے پاکر خود بھی اختیار کرتا ہے اور دنیا کے سامنے بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ ..... (۱۰/۱۰۴)۔ اے نوع انسان! اگر تم میرے دین کے متعلق کسی قسم کے شک میں ہو تو ..... یعنی اس دین کے متعلق جسے میں پیش کرتا ہوں۔

کیا ہم توقع کریں کہ ارباب "فکر و نظر" اس کی تصحیح اپنے مجلہ میں کر دیں گے تاکہ اس کے قارئین، دین کی ایسی عظیم حقیقت کے متعلق غلط فہمی میں نہ رہیں؟

---

[1] دین کے معنی مذہب کے نہیں ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر وہ دوسرا نکتہ ہے جسے ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

شکوک • شبہات

اعتراضات — پیدا ہوتے ہیں۔

سلیم کے نام خطوط

کس کے دل میں؟ نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کے دل میں!

ان کا جواب آپ کے پاس کیا ہوتا ہے؟

ماتھے کی شکن، جھڑکی، لاحول،

کیا اس سے ان کے وہ شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟

اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔

یہ شکوک رفع ہوتے ہیں دلائل و براہین سے، علم اور بصیرت سے۔ بشرطیکہ

سمجھانے کا طریقہ بھی دلنشین اور جاذبِ توجہ ہو —!

اگر آپ فی الواقع کسی نوجوان کے دل سے شکوک اور شبہات کی پھانسیں نکالنا چاہتے ہیں تو اُسے

دیجئے!
اور پھر دیکھئے کہ
اس میں کیا انقلاب
آتا ہے!

قیمت

جلد اول ۸ آٹھ روپے، دوم چھ روپے، سوم چھ روپے ملنے کا پتہ :- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گذری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف

پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملیگی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔
افلاطون اعظم سے لیکر آج تک گذشتہ
اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے
مفکرین، مؤرخین اور علمائے
اخلاقیات وعمرانیات اور
ماہرین معاشیات و سیاسیات
نے کیا سوچا؟

اُسے پڑھئے۔ اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت :- بارہ ۱۲ روپے • ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور